

گردش دوراں

افسانے رافسانے

حسن ساہو



میزان پبلشرز سرینگر کشمیر

گردش دوراں

افسانے/افسانے

عزیز سلیم سادک
محکم خدمت مع
اپنا سیت
ساحہ

مصنف

حسن ساہو

الکھنات، ہمانیہ کالونی، برمنہ

سرینگر 190018 کشمیر

فون: 0194-2491910

موبائل: 09906439491

رابطہ:

ناشر

میزان پبلیشرز (وجہنہ)

ہال قاتل قاز اینڈ ایمر جنسی سرورس ہیڈ کوارٹرس بید مالو، سرینگر کشمیر

نام کتاب: گردش دوراں
 نام مصنف: غلام حسن بٹ
 تخلص: حسن ساہو
 ناشر: میزان پبلشرز، سری نگر کشمیر
 کمپوزنگ: شمار شاہ
 سال اشاعت: 2009ء
 تعداد: ۵۰۰
 سرورق: آفتاب
 مطبوعہ: میزان سرورق
 قیمت: تین سو پچاس روپے
 زیر اہتمام: شبیر احمد

Author : Hassan Sahu
 Hamdania Colony, Bemina
 Srinagar 190018- Kashmir
 Cell No.09906439491
 Phone: 0194-2491910
Publisher: Meezan Publications
 Opp. Fire and Emergency Services
 Head Quarters Batmaloo
 Srinagar-190009
 FAX- 0194-2457215
 Mob:09419002212
 E.mail. Meezanpublishiers@rediffmail.com

گل نفس ذایقہ الموت



افسارِ حیات (دورِ ایں) طباعت کے آخری مراحل میں تھا کہ احقر کو
جانکاہِ صدمہ سے درچار ہونا پڑا۔ پچاس برسوں کی رفیقِ حیات (لاڈلیِ حسن) اپنے
نہال (جبل پور، ایم پی) میں دورانِ قیام مختصر علالت کے بعد 16 جون 2009ء کو داغِ
مفارقت دے گئیں۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ)
مرحومہ گونا گوں صلاحیتوں سے لبریز پاک سیرت خاتون کے علاوہ مختلف موضوعات
پر کاغذِ داغدار کیا کرتی تھیں۔ ادبی سفر میں اس کا تعاون بسا اوقات دستیاب رہتا تھا۔
قارئینِ کرام سے ایصالِ ثواب کے لئے سورۃ فاتحہ کا ملتمس ہوں۔ آخر پر مرحومہ
کا ایک شعر

لو چین والو سنبھا لو اپنا گھر
ہم چلے، لو ہم چلے، لو ہم چلے

سوگوار
حسن ساہو

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
1	انتساب	۱
2	پیش لفظ (اشرف آثار)	۲

افسانے

11	مندرسے مسجد تک	۳
21	ملاپ	۴
36	امانت	۵
51	ہم سفر	۶
58	بھنورا	۷
64	راکھ ہوتی زندگی	۸
68	ترش رو	۹
75	ماں بننے کا خواب	۱۰
82	تیرہ بختی	۱۱
93	صدائے بازگشت	۱۲
98	ایک پہلو یہ بھی ہے	۱۳
104	تصویر کا دوسرا رخ	۱۴
113	جینے کا سہارا	۱۵
120	گر گٹ صفت	۱۶
126	رنج سے خوگر	۱۷

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
131	جانکاہ صدمہ	۱۸
136	اعتبار	۱۹
143	اتفاق کی بات	۲۰
149	خلاصی	۲۱
155	اُجاڑ	۲۲
161	زمانے کے رنگ	۲۳
166	کھرا اور کھوٹا	۲۴
172	پیروی	۲۵
176	درس عبرت	۲۶
180	گردش دوراں	۲۷

افسانچے

195	انتظار	۱
196	بیدار مغز	۲
198	مین ہول	۳
199	وفا پرستی	۴
202	وقت وقت کی بات	۵
205	بازو بند	۶
208	خواب و خیال	۷
211	نیا سویرا	۸
214	گوہر گر انماہیہ	۹
215	موری کے کیڑے	۱۰

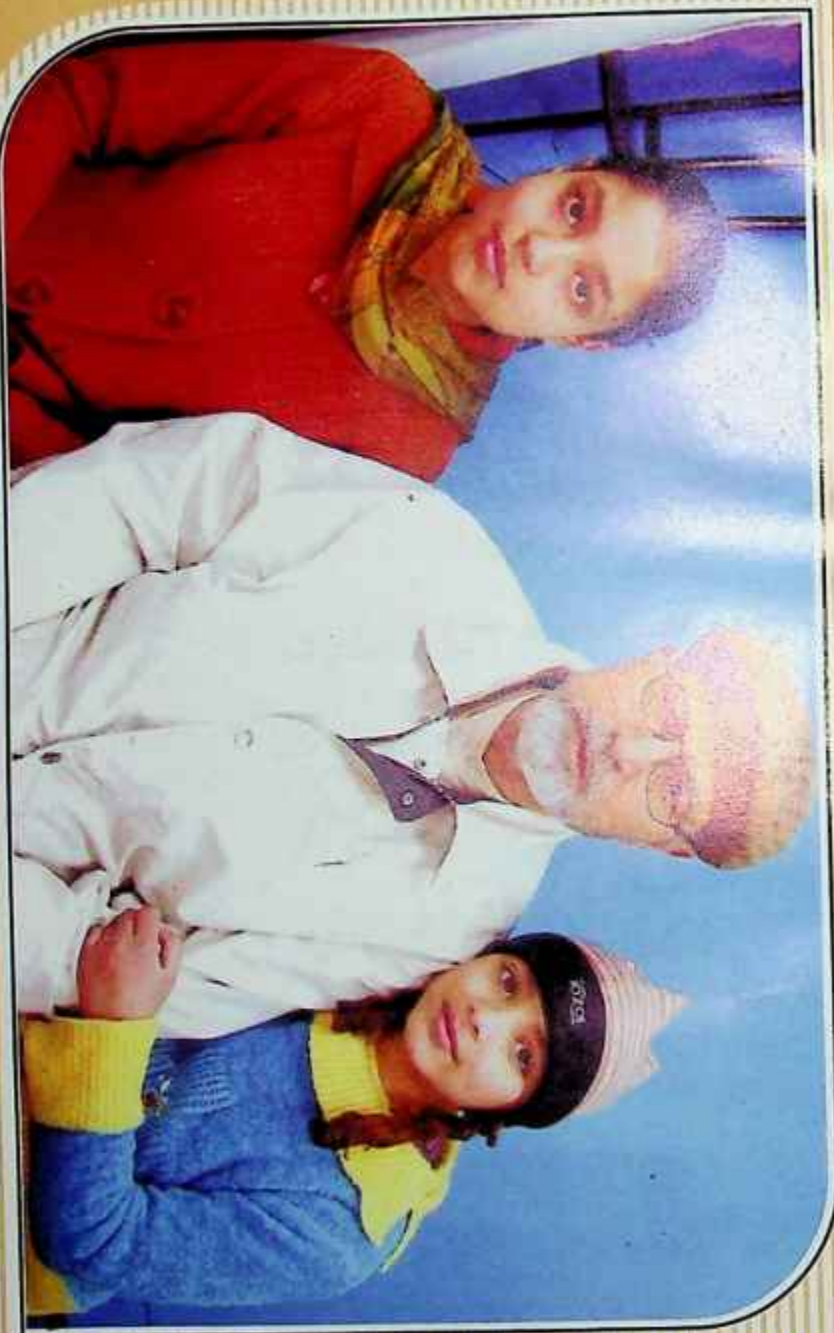
صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
217	مشورہ	۱۱
218	اپنائیت کا صلہ	۱۲
220	کڑواچ	۱۳
222	تارکول کا ڈرم	۱۴
225	میرے اپنے	۱۵
227	سراب	۱۶
229	رغبت	۱۷
231	مُخبر	۱۸
233	کباڈیا	۱۹
234	ہمدردی کی آڑ میں	۲۰
236	برقع پوش	۲۱
237	شناختی کارڈ	۲۲
238	دوسرا روپ	۲۳
239	سفید خون	۲۴
241	سرکار کے خیر خواہ	۲۵
243	تضاد	۲۶
245	بوجھ	۲۷
247	رفیق حیات	۲۸
250	جذباتی اندازِ فکر	۲۹
251	ہڑتال	۳۰

صفحہ نمبر	عنوان	نمبر شمار
253	متضاد سوچ	۳۱
255	اپنا پرایا	۳۲
258	کوتاہ اندیش	۳۳
260	گھنا و نی تصویر	۳۴
262	عتاب زدہ	۳۵
267	واپسی	۳۶

271-300 ہمارے بھی ہیں مہربان -----

- (۱) مولانا حسن عباس فطرت پونے (۲) مظہر امام دہلی (۳) مرحوم آئند بخشی بمبئی
 (۴) پروفیسر فضل امام رضوی لکھنؤ (۵) ڈاکٹر اکبر حیدری (۶) مرحوم حکیم منظور (۷) ہدم
 کاشمیری (۸) غلام نبی خیال (۹) وجیہہ احمد اندرابی (۱۰) مرحوم عمر مجید (۱۱) آنجنابی موہن یاور
 (۱۲) پروفیسر مجاہد اللہ خان (۱۳) وریندر پٹواری (۱۴) عبدالغنی شیخ (۱۵) دیپک بدکی (۱۶) ڈاکٹر
 رینو بہل (۱۷) اورے سرن ارمان (۱۸) مرحوم صوفی محی الدین (۱۹) مرحوم پروانہ ردولوی
 (۲۰) ڈاکٹر محمود شیخ (۲۱) وسیم مینائی (۲۲) ڈاکٹر سہیل انجم (۲۳) سید محمد جابر جوارسی (۲۴) مدیر
 ماہنامہ کتاب نما (۲۵) مرحوم ڈاکٹر امام مرتضیٰ (۲۶) راشتر یہ سہارا دہلی (۲۷) شجاع کاشمیری
 (۲۸) پروفیسر ہمراہ کاشمیری (۲۹) زاہدہ تقدیس فردوسی (۳۰) اوم پرکاش بجاج (۳۱) مولانا
 غلام حسین باقری (۳۲) ڈاکٹر نذیر مشتاق (۳۳) بے تاب جے پوری جموں (۳۴) سلیم
 انصاری جبل پور (۳۵) ڈاکٹر قاضی اشرف (۳۶) عبدالرشید شاہ (۳۷) خندان لکھنؤی (۳۸)
 ہفت روزہ سیاست جموں (۳۹) اوم پرکاش کپور، ہریانہ (۴۰) انجنیر ارشد حسین خان (۴۱) سید
 سجاد حسین رضوی

پروفیسر سید محمد رفیع



انتساب

نواسی نایاب اور پوتی آفرین
کے نام

جن کی معصومانہ ڈانٹ ڈپٹ
اور تکرار نے پُر آشوب حالات
میں بھی ”گردش دوراں“ کو
ترتیب دینے کی ترغیب دی۔

پیش لفظ

(ڈاکٹر اشرف آثاری، صدر بل حضرت بل)

ریاست جموں و کشمیر نے اُردو زبان و ادب کو کئی معتبر نام دیئے ہیں موجودہ افسانہ نگاروں میں کئی نامور کہانی کار ہیں جن کی تخلیق کردہ افسانوں کو اُردو ادب میں خوب پزیرائی حاصل ہوئی ہے آج بھی ان کا تخلیقی سفر شد و مد سے جاری ہے اور انہیں اور ان کے ادب پاروں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔

کہانی کاروں کی موجودہ پود میں کچھ کہانی کار ایسے بھی ہیں جن کا ادبی سفر کم و بیش نصف صدی کے عرصے پر محیط ہے ان ہی میں ایک افسانہ نگار حسن ساہو بھی ہیں۔ حسن ساہو کے ساتھ لکھنے والے ان کے ہمعصر کچھ کہانی کار ابھی تک میدان ادب میں بڑی جواں مردی اور ہمت کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ داستان کہتے کہتے اونگھنے لگے، کچھ سو گئے اور کچھ تھک ہار کر پس منظر میں چلے گئے ہیں لیکن حسن ساہو نصف صدی گزر جانے کے باوجود بھی کارواں ادب کے ساتھ ساتھ کسی تھکن یا گھٹن کے بغیر ہی نئے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر منزل کی جانب بڑے جوشیلے انداز میں اور بڑی پھرتی کے ساتھ سرگرمی سے رواں دواں ہیں۔

حسن ساہو کا پہلا افسانوی مجموعہ ”پھول کا ماتم“ کافی پہلے چھپ چکا ہے اور

اسکے بعد ان کا دوسرا مجموعہ ”بستی بستی صحرا صحرا“ چھپ کر آگیا اور پھر آج سے لگ بھگ بارہ سال قبل ۱۹۹۶ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ”اندھا کنواں“ چھپ کر منظر عام پر آگیا اور اب چوتھا افسانوی مجموعہ ”گردشِ دوراں“ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ نصف صدی پر محیط حسن ساہوکی ادبی زندگی کا بھرپور جائزہ لینا یہاں ممکن نہیں ہے اور یہ کام جبل پور یونیورسٹی میں ایک طالبہ کر رہی ہے جس نے حسن ساہوکی شخصیت و فن پر اپنا مقالہ مکمل کر لیا ہے اور وہ جلد ہی اسے ڈاکٹریٹ کے لئے پیش کرنے جا رہی ہے۔ انہوں نے اس عرصے میں کافی کہانیاں تحریر کیں لاتعداد مضامین و مقالات تحریر کئے جو مختلف موضوعات پر تھے۔ مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات، حالاتِ حاضرہ اور ملی اتحاد و اتفاق وغیرہ پر۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ جرنلزم میں مکمل طور پر آگئے، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار ہی ہیں۔ شاعری سے ان کا شغف ابتدا سے ہی تھا۔ سخن فہم ہیں لیکن یہ بات حال ہی میں منظر عام پر آئی کہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ مقامی اخبارات کے علاوہ ان کی غزلیں وغیرہ ماہنامہ شاعر اور انشاء میں بھی چھپنے لگیں۔

”اندھا کنواں“ حسن ساہوکی ۳۳ کہانیوں پر مشتمل ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ حسن ساہو کے سینے میں ہمدرد انسان کا دل دھڑکتا ہے اپنے آس پاس کے ماحول سے انہیں اپنی کہانیوں کے پلاٹ بہ آسانی مل جاتے ہیں ان کا دل ایک شاعر کے دل کی طرح انتہائی نازک اور حساس دل ہے جو کسی بھی معمولی سے واقعے سے بھی متاثر ہو کر چیخ اٹھتا ہے اور کر اہتا بھی ہے اور اس کے بعد کسی بھی ایسے واقعے کا ردِ عمل ہمارے سامنے ایک خوبصورت کہانی کے روپ میں ظاہر ہو جاتا ہے واقعہ جتنا متاثر کن اور سنگین نوعیت کا ہوگا اتنا ہی متاثر کن اور خوبصورت اس کا ردِ عمل بھی ہوگا اور اتنی ہی اچھی اور جاندار کہانی بھی

تخلیق ہوگی۔ یہ کہانی رُلانے والی بھی ہو سکتی ہے اور ہنسانے والی بھی اس کے علاوہ حسن ساہو کی کہانی قاری یا سامع کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔

حسن ساہو ”اندھا کنواں“ میں خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”میں خود حقیقی کہانیوں کا متلاشی ہوں“ ”اندھا کنواں“ میں شامل ان کی اکثر کہانیوں کا تانا بانا ہمارے آس پاس کے ماحول سے ہی بنا گیا ہے۔

اُردو زبان کے مقابلے میں جو موجودہ متمدن، ترقی یافتہ اور بڑی عالمی زبانیں ہیں ان کے نامور اور قد آور کہانی کاروں کی کثیر تعداد نے بھی اپنے سماج سے تعلق رکھنے والے غریب طبقے یا پھر مفلوک الحال کسانوں، مزدوروں وغیرہ کو ہی زیادہ تر اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ آپ روسی زبان کے مشہور کہانی کار چیخوف کی کہانیوں کو ہی لے لیجئے ان کی کہانیوں نے ہر ایک قاری کو متاثر کیا ہے کہ ان کی ایک ایک سطر گڑھی ہوئی نہیں بلکہ مٹی بر صداقت نظر آتی ہے۔ لہجہ نرم اور صاف و شفاف، زبان و بیان بالکل سادہ اور ہموار، الفاظ و تراکیب اور استعارے عام فہم اور آسان، میدانی علاقے میں گزرنے والے دریا کی روانی اور ندرت خیال، نہ خود کو بڑا عالم و فاضل پیش کرنے کے جنون میں گنجلک و ثقیل الفاظ کا استعمال ہی اور نہ ہی خواہ مخواہ کاسٹنس قائم کر کے قاری کے ذہن کو الجھانے کی دیدہ و دانستہ کوشش ہی، نہ فلمی انداز میں مکالمہ بازی یا کہانی کا ابتداء و اختتام کرنے کی سعی ہی اور نہ ہی اپنی کہانیوں میں مافوق الفطرت واقعات کی کچھنڑی ڈال کر لوگوں کو ششدر و حیران کرنے کا کوئی ارادہ یا رجحان ہیں۔

”اندھا کنواں“ میں شامل افسانچہ ”بدلہ“ میں ایک باپ رمضان اپنی ہر ایک چیز اپنے اکلوتے انجینیر بیٹے کی پڑھائی اور اسکی شادی کرنے پر اس اُمید پر دواؤ پر لگاتا ہے کہ

اس کا بوڑھا چلّا آرام سے گزر جائے لیکن اس کا اکلوتا بیٹا پرویز اپنی نئی نویلی دُہنِ رضیہ کے ساتھ کلب کی رنگ رلیوں میں کھو جاتا ہے اور مجبور دے بس رمضان گلی کی نکلز پر دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک اور طویل افسانے ”اندھا کنواں“ کو ہی لے لیجئے، اسی افسانے کے عنوان پر افسانوی مجموعے کا نام بھی رکھا گیا ہے۔ ”اندھا کنواں“ بھی چند برہنہ سچائیوں کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ”اندھا کنواں“ کی مرکزی کردار آئینہ جیسی لا تعداد لڑکیوں کو روتے اور سکتے ہوئے دیکھتے ہی نہیں بلکہ ہم میں سے ہی بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو معصوم و مجبور لا تعداد آدمیائوں کی بربادی کا کارن بن کر ان کی پاکیزہ زندگیوں کو داغدار اور جہنم زار بنا دیتے ہیں اور پھر اپنی ہوس اور عیش پرستی کی خاطر انہیں نخل کے بستر سے اتار کر گلی کے کسی کوڑے دان میں پھینک دیتے ہیں یہ صرف مردوں کا شیوہ ہی نہیں ہے بلکہ اس طرح کے کام میں دلال کے روپ میں رحمن چاچی بھی میدان میں اُترتی ہے اور صمد چاچا کی امانت کی خیانت کر کے دنیا اور اپنی عاقبت واقعی خراب کر دیتی ہے۔ جوں جوں افسانہ آگے بڑھتا ہے تو قاری کو اس کے اختتام کی فکر ستانے لگتی ہے حسن سا ہونے جس انداز سے اس افسانے کا اختتام کیا ہے وہ واقعی ان کی ماہرانہ بصیرت اور اُردو افسانے کے مزاج سے بھرپور واقفیت اور گہرے مطالعے ہی کا ثمرہ ہے انہوں نے ایک مخصوص تشنگی چھوڑی ہے کہ ہر قاری کو کہانی پڑھ کر یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ وہ جبل پور جا کر حاجی یوسف تارا کی اسٹیٹ میں آئینہ کے بارے میں دریافت کرے کہ کہانی میں جس مقام پر آئینہ کو چھوڑا گیا تھا اس سے آگے پھر اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا یا ہو رہا ہے؟ میرے خیال میں افسانے یا کہانی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کہانی یا افسانہ نہ لگے بلکہ اس پر ایک

جیتی جاگتی سچائی کا گمان گزرے حسن ساہو اپنی لگ بھگ ہر کہانی میں اس تاثر کو برقرار رکھنے میں بالکل کامیاب نظر آتے ہیں۔

حسن ساہو جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں اُسے دامن صفحہ قرطاس تک پہنچاتے ہیں۔ ان کا اور ایک افسانہ ”انسانیت کی موت“ میں ایک ہی مذہب، ایک ہی ملک و ملت اور ایک ہی مسلک کے لوگوں میں سیاسی و نظریاتی اختلافات کی وجہ سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے ایک دوسرے سے شدید نفرت اور اختلاف رائے سے خاندانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں چھوٹے بچے عورتوں اور بزرگ افراد کو بھی بخشا نہیں جاتا اور انجام کار اس کہانی کا مرکزی کردار اعجاز اپنا سب کچھ، بیوی، بچہ، گھر کھودیتا ہے اور خود پاگلوں کی طرح اس سارے ہنگامے کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہے کہ آخر وہ اس کی بیوی، بچہ جنہیں یہ سخت ترین سزا مل گئی کہاں تک اپنی ناکردہ گناہوں کے لئے ذمہ دار تھے؟ وہ ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے اور اپنے ان ناکردہ گناہوں کی سزا پا کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے مصنف اس کہانی کے ذریعے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اپنے مخصوص کریدنے اور تڑپانے والے انداز میں کہہ دیتے ہیں گویا ایک سرجن کی طرح نشتر سے گلے سڑے زخم کو کرید کرید کر یہ احساس دلاتے ہیں کہ جو ناسور ہمارے سماج کی رگوں اور ریشوں میں پھیل رہا ہے یا پھیل چکا ہے اس کی طرف فوری توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اس طرح کی پروجیشن افسانے میں پیدا ہو جانے پر اگر کہانی کار کی اپنی ذاتی رائے یا خیال، غیر شعوری طور پر یا پھر کہانی کے پلاٹ کے تقاضے کو مد نظر رکھ کر در آئے تو اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کی قطعی کوئی گنجائش نہیں کہ متعلقہ کہانی کار کا لب و لہجہ ناصحانہ ہے یا

پھر اس کا اظہار خیال خطیبانہ ہے۔ یا پھر وہ ایک کہانی کا ر کم اور مبلغ زیادہ ہے جیسے کہ کچھ ہمعصر کہانی کاروں کو حسن ساہو کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔

”زندگی کا کرب“ ایک عمدہ کہانی ہے اس کہانی کو اول تا آخر کئی بار پڑھنے کے بعد عام قاری اپنی سوچ و فکر کی گہرائیوں میں متواتر غوطے کھا کر یہ طے کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے کہ کہانی کا عنوان زندگی کا کرب اس کہانی کے مرکزی کردار ڈاکٹر ارشد یا اسکی مریضہ نسرین یا پھر نسرین کی والدہ کی زندگی کا کرب ہے؟ یا پھر ان تینوں کرداروں کی زندگی کا کرب ہے؟ کچھ بھی ہو ان تینوں کرداروں کی زندگیوں کے کرب کو سب لوگوں کی زندگیوں کا کرب بنانے میں مصنف کامیاب ہو چکے ہیں۔

”اندھا کنواں“ میں شامل ہر ایک کہانی اُردو افسانے کے معیار پر پورا اترتی ہے اور ہر ایک کہانی منفرد اور الگ الگ موضوعات اور مسائل پر لکھی گئی ہے اور ایک اچھوتے انداز میں لکھی گئی ہے۔ حسن ساہو کی کہانیوں میں کئی خوبیاں ہیں اگر زبان و بیان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ حسن ساہو کے آگے اُردو زبان و ادب کا پچاس سالہ مطالعہ واقعی رنگ لایا ہے خوبصورت اور بر محل الفاظ و تراکیب اور محاوروں کا استعمال اور انکے باہمی ربط و امتزاج کا خوب خیال رکھنا انہیں خوب آتا ہے۔ خواہ کوئی واقعہ کتنا بھی مشکل کیوں نہ ہو یہ بھرپور تاثر ملتا ہے کہ مصنف ایک کمینیٹیئر کی حیثیت سے نہیں بول رہے ہیں اور نہ ہی ایک داستان گویا پھر تماشاہ بین بن کر کچھ بیان کر رہے ہیں۔ بلکہ ایک ایسے شخص کی طرح اپنے اندرونی جذبات و احساسات کو زبان دے رہے ہیں بالکل ایسے جیسے یہ سب کچھ، جسے وہ بیان کر رہے ہیں ان کی خود اپنی ذات پر بیت رہا ہو۔ شاید یہ بھی ایک خاص وجہ ہے کہ حسن ساہو کی اس طرح کی اکثر تحریریں کافی متاثر کرتی ہیں اور

قاری کو اپنے ساتھ بہت دور تک سبک رفتاری اور خوشگوار موڑ میں بہا کر لے جاتی ہیں۔ اسی طرح حسن ساہو کے تازہ افسانوی مجموعے ”گردش دوران“ میں شامل کہانیاں بھی بہت متاثر کرتی ہیں جنہیں پڑھ کر حسن ساہو کی نئی اور تروتازہ سوچ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ”گردش دوران“ میں شامل گردش دوران، بیدار مغز، مین ہول، بوجھ، اپنائیت کا صلہ، تارکول کا ڈرم، ماں بننے کا خواب، تصویر کا دوسرا رخ، ہمسفر، گرکٹ صفت، مندر سے مسجد تک، رغبت پھنور، وغیرہ سبھی افسانے اور افسانچے یا منی افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں خاص طور پر ”امانت“ ایک عمدہ کہانی ہے جس کہانی کا ہر کردار اپنے مقدور کے مطابق ہی کہانی کو ایک خوبصورت انجام تک لے جاتا ہے۔ مذکورہ افسانوں میں اکثر افسانے ملک کے مقتدر اُردو رسالوں و جرائد میں وقتاً فوقتاً چھپ بھی گئے ہیں اور اُردو قارئین کے ایک بہت بڑے طبقے کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ لیکن اب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کہانیاں سب کتابی صورت میں منظر عام پر آ گئی ہیں اور ”گردش دوران“ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

حسن ساہو سوچ سمجھ کر کہانیاں لکھتے ہیں وہ صرف اسلئے کہانیاں نہیں لکھتے ہیں کہ رسائل و جرائد میں اپنی حاضری لگا سکیں یا پھر انہیں کہانی لکھنے کی لت پڑ گئی ہے یا پھر کسی بھی طرح کی کہانی لکھنے سے وہ اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہتے ہیں بلکہ وہ کہانی صرف اسلئے لکھنا چاہتے ہیں یا لکھتے ہیں یا لکھنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ انہیں کوئی ایسا واقعہ مجبور کر دیتا ہے کہ وہ کہانی لکھیں انہیں کوئی فکر، کوئی سوچ تڑپا دیتی ہے متاثر کرتی ہے تو وہ ہمیں ایک خوبصورت کہانی دیتے ہیں۔ ان کی کہانیاں اسی طرح کے واقعات کی پیداوار ہیں وہ کہانی کے پلاٹ کے پیچھے پیچھے نہیں بھاگتے بلکہ کہانی کا پلاٹ ہی ان کے پیچھے پیچھے

بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں کسی رونما ہونے والے واقعے یا حادثے کا
 افسانوی روپ ہوتی ہیں اسلئے زندگی سے قریب سے قریب تر نظر آتی ہیں۔ کوئی اسہا طیری
 یا الف لیلوی داستان نہیں ہوتیں اور ان میں عام لوگ جیسے کردار ہی نظر آتے ہیں۔
 ہمارے آگے پیچھے، دائیں بائیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے والے کردار زیادہ تر متوسط طبقے
 یا پھر غریب و مفلس اور نادار و مجبور لوگ جنکی زندگیوں کا ہر ایک گزرنے والا پل بذات خود،
 ایک کہانی، ایک افسانہ ایک روداد ہوتا ہے جن کی ایک ایک حرکت ایک ایک افسانے کو جنم
 دیتی ہے۔ سماج یا معاشرے میں ہر طبقے کے لوگ طرح طرح کی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں
 لیکن جو کہانیاں یا جو کردار ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں یا بہت دیر تک حاوی
 ہو جاتے ہیں ہماری اندر کی انا اور ہماری روح کو متاثر کرتے ہیں وہ زیادہ تر سماج کے انہی
 مفلس و نادار لوگوں کی کہانیوں کے کردار ہوتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے ایک ایک
 سانس سے اُلجھنے والے اور ایک ایک سانس کی مہنگی سے مہنگی قیمت ادا کرنے والے کردار
 اردو کے مشہور و معروف اور صفِ اول کے کہانی کار پریم چند بھی معاشرے کے اسی طبقے
 سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے گھروں میں جھانک کر ان کا دکھ درد سمیٹتے تھے۔ حسن
 ساہو بھی زیادہ تر اسی مجبور و بے بس سماج کے مسائل کی عکاسی میں مصروف نظر آتے ہیں۔
 کہا جاتا ہے کہ ہر دس برس کے بعد ترقی یافتہ یا ترقی پذیر زبان پر کوئی نہ کوئی
 جدید رجحان یا تحریک غالب آتی ہے۔ اس طرح شاعر یا ادب یا فنون لطیفہ سے وابستہ دیگر
 تخلیق کار کسی نہ کسی تازہ وارد ہونے والی تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ حسن ساہو اپنے
 پانچ دہائیوں پر محیط ادبی سفر کے دوران کسی بھی تحریک یا کسی بھی ازم سے وابستہ نہ ہوئے۔
 ہمیشہ بس اپنی ہی دھن میں مگن رہے اور لکھتے رہے۔

حسن ساہوکی کہانیاں اُن کے بھرپور تجربے، صحت مند فکر و سوچ، وسیع و عریض مطالعے اور بھرپور مشاہدے کی غمازی کرتی ہیں اُردو ادب کے قلم کاروں اور تخلیق کاروں کے فن پاروں کی خوبیوں اور محاسن کو ان کے گزرنے کے بعد پرکھنے اور دیکھنے سمجھنے کا جو رجحان ہمارے ہاں ابتداء سے ہی ہے اگر ایسا ان کی زندگیوں میں ہی ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ حسن ساہو اس ضمن میں خوش قسمت ہیں کہ ان پر ریاست سے باہر کام ہو رہا ہے۔ جیسا کہ میں اوپر بھی عرض کر چکا ہوں اُمید ہے کہ یہ چند باتیں بھی ان کی شخصیت و فن کے متعلق انہیں سمجھنے اور پرکھنے کے ضمن میں کارآمد ثابت ہوں گی۔

اشرف آثاری

۳۰ مارچ ۲۰۰۹ء



نور شاہ حسین احمد خان اعظمی



مندر سے مسجد تک

جبل پور (مدھیہ پردیش) کے گنجان آباد علاقے بھرتی پور میں اپنے سرال کا مسکن ہے

بھرتی پور کی بستی دراصل ملی جلی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ ملک آزاد ہونے سے اب تک مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد اس علاقے میں سکونت پذیر ہیں۔

بھرتی پور جنرل روڈ تو سیکولر ملک کی ایک قابل تقلید نشانی سے کم نہیں۔ بڑی اوستی چوک سے لے کر گلگلہ چوک تک پھیلی لگ بھگ ایک فرلانگ سڑک کے دونوں جانب دکانوں اور بڑی چھوٹی عمارتوں کے علاقہ میں مختلف مذاہب سے وابستہ عبادت گاہیں اپنے ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔

اس سڑک کے پہلے چوک پر درگا مندر اور دوسرے چوک پر مینار والی مسجد مداحوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں پیش پیش ہے۔ مندر اور مسجد کے درمیان ایک گر جا گھر ایک گردوارہ اور سندھی برادری کا تعمیر کردہ جھولے لال مندر بھی ہے۔

عموماً مشاہدے میں آیا ہے کہ الگ الگ عقیدوں کو دلوں میں پالنے والے اس بستی کے مکین ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور خوشی و غم سے متعلق تقریبات میں بڑھ چڑھ کر

حصہ لیا کرتے ہیں۔

سالہا سال سے محبت و اخلاص سے لبریز ماحول دیکھنے کو ملتا رہا۔ بارہا دل نے چاہا کہ کاش اس طرح کی اخوت و رواداری ملک کے دوسرے حصوں میں بھی دیکھنے کو ملتی۔ عبادت گاہوں والی اس سڑک پر بھکاریوں کی تعداد بھی بہت زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ صبح سویرے مسجد و مندر کے سامنے وہ عبادت کرنے والوں کے آگے دست سوال دراز کرتے رہتے ہیں۔ مخصوص اوقات پر گر جاگھر اور گردوارہ کے روبرو غریب و نادار لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ حالانکہ ان بھکاریوں میں مسلمان، عیسائی، ہندو سکھ سب مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد ملتے ہیں لیکن ہم پیشہ ہونے کے باعث وہ ایک دوسرے کے ڈکھ سکھ میں بلا امتیاز رنگ و نسل بھرپور حصہ لیا کرتے ہیں۔ اگر رحیم کو مصیبت سے واسطہ پڑا تو پیٹر، اوتار، یارام داس کو یقیناً اپنی چنگل میں لے لیتی، وہ تڑپ اٹھتے۔ البتہ ان بھکاریوں میں ایک شخص نہایت ہی سنجیدہ مزاج اور صاف گو مانا جاتا ہے۔ اسے ہر مذہب سے ایک خاص قسم کا لگاؤ رہا ہے۔ لغویات و فضولیات سے الگ تھلگ ہر مذہب کے بنیادی اصولوں و قدروں کی رکھوالی کرنا وہ اپنا فرض جانتے ہیں۔ لوگ اسے ”بیساکھی والے بابا“ کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں۔ معذور ہونے کے باعث بیساکھی کے سہارے چلتے ہیں۔ بیساکھی والے بابا ہر مذہب کی تقریبات میں بھرپور حصہ لیا کرتے ہیں۔ وہ کسی خاص عقیدے سے وابستہ نہیں یہی وجہ ہے کہ جبل پور شہر میں ان کی ہر کوئی عزت کرتا ہے۔

سننے میں آیا ہے کہ بیساکھی بابا گر جاگھر کے پاس گروندی بازار کے نکل پر لاوارث بچے کی صورت میں ولیم پادری کو ملے تھے۔ وہ بھرتی پور کی رنگارنگ تہذیب میں پلتے رہے

اور پھر ہر عبادت گاہ میں جا کر وہ اچھی باتوں کو لڑکپن سے ہی سنتے آئے ہیں۔ ان کے خیالات میں بہت ہی وسعت و گہرائی پائی جاتی ہے۔

”کیوں بابا“ آپ اصلیت میں کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں؟ ایک روز ایک روپے کا سکہ ان کے کشتول میں ڈالتے ہوئے میں نے پوچھ ہی لیا۔

”صاحب! مذہب کیا ہے اس مالک و داتا کو پہچاننے

کا ایک ذریعہ ہے۔ آخری منزل تک سفر کرنے کا ایک

راستہ ہے۔ بھلائی کرو، بدی سے دور رہو، سچ بولو، اور ہر

ایک سے محبت جتاؤ، ایسا کرنے سے تو میرے خیال میں

ہر مذہب کی پیروی ہو سکتی ہے اور مالک کی خوشنودی

حاصل کی جاسکتی ہے۔“

”لیکن پھر بھی اپنی پہچان کی خاطر کسی ایک مذہب سے وابستہ رہنا لازمی ہے“

میری رگ بحس پھڑک اٹھی۔

”صاحب سب مذاہب و عقیدوں سے بڑھ کر بھی ایک عقیدہ ہے ایک مذہب ہے اور وہ ہے انسانیت کا جس نے انسانیت کی راہ کو اپنایا اس نے داتا اور جگ کے مالک کی خوشنودی حاصل کر لی“

اس کے مدلل جواب کے آگے میں لا جواب ہو گیا۔ ہر مذہب کے لوگ تو درکنار

خود پنڈت، مولوی، پادری اور گیانی جی تک ان کے ارفع خیالات کی قدر کیا کرتے ہیں۔

جب بھی میں جبل پور جاتا۔ اپنے فالتو وقت کا کچھ حصہ بیساکھی بابا کی صحبت میں

گزارنے کی کوشش کرتا۔ ان کے سمجھانے کا ایک خاص انداز ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے

مذہب و عقیدے کے مطابق ہی نصیحت کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ان کی بات کا

مان رکھتا آیا ہے۔

برسہا برس سے درگاہ مندر کے قریب ہی لکشمی ٹاکیز موجود تھی۔ اس شیطان گھر کو بند کروانے کے لئے کچھ برس قبل ہر فرقے کے لوگوں نے بھرپور انداز میں مہم چلائی۔ احتجاج سے کام لیا۔ لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

آخر کار بیساکھی بابا نے سینما گھر کے مالک دیوان جی کو اس کی عالیشان کوٹھی پر جا کر سمجھایا۔

”دیوان جی! آپ کو پرتمانے بہت کچھ دیا ہے۔ ذرا غور کرو کہ اپنی یہ چھوٹی سی بستی عبادت گاہوں کی وجہ سے متبرک جگہ بن چکی ہے۔ مندر اور گرجا گھر کے پڑوس میں سینما گھر کا ہونا کیا زیب دیتا ہے؟ عبادت گاہوں کے تقدس کو بنائے رکھو گے تو بھگوان آپ کو سنکھ ہی سنکھ سے نوازے گا۔“

بیساکھی بابا کی باتوں میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ دیوان جی نے سینما کی بلڈنگ سے دایموں مقامی ٹرسٹ کے ہاتھ فروخت کر دی۔ اس بلڈنگ میں غلہ اسٹور ہوتا ہے اور سڑک کی جانب دکانیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔

اسی طرح ایک بار سسرال جانے کا اتفاق ہوا تو بازو والے جھولے لال مندر میں لاؤڈ اسپیکر پر ”ہرے رام۔۔۔ ہرے رام۔۔۔ رام۔۔۔ رام۔۔۔ رام۔۔۔ ہرے کرشن۔۔۔۔۔ ہرے کرشن۔۔۔۔۔ کرشن کرشنا“ کچھ دنوں سے یہ جاپ بلا ناغہ جاری تھی۔ دن میں عورتیں اور رات کو مرد جاپ میں حصہ لیتے۔

گیانی پان والے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ دس روز تک جاری

رہے گا۔ یقین کیجئے چوبیس گھنٹے کے شور و غل نے خاص کر میری ساس کو زیادہ ہی پریشان کر رکھا تھا۔ جو کچھ ماہ سے بستر علالت پر دراز پڑی تھی۔

کسی ایک نے بھی جرأت نہیں کی کہ اس جاپ کے خلاف احتجاج کرے اور کرتا بھی کیسے جبکہ ہر مذہب کے ماننے والے کچھ متبرک دنوں میں لاؤڈ اسپیکر پر گھنٹوں پروگرام نشر کیا کرتے ہیں۔

”کوئی مذہب اجازت نہیں دیتا کہ اپنے ہمسایہ کو کسی طرح کی تکلیف پہنچائے۔ ہو سکتا ہے کہ پڑوس میں کوئی بیمار ہو یا کوئی طالب علم پڑھ رہا ہو۔ تو اس طرح کے شور سے بُرے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اگر متواتر کچھ دنوں تک ریاضت کرنی ہے تو موزون رہتا کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال نہ کیا جائے۔

بیساکھی بابا کی باتیں سن کر جھولے لال مندر کے منظمین کو کچھ احساس ہوا اور اس کے بعد لاؤڈ اسپیکر کا استعمال رات کے لئے بند کر دیا گیا۔

ویسے اس بار مہر و محبت بھری بستی کے تیور کچھ بدلے بدلے نظر آئے۔ نہ رواداری کے وہ چرچے اور نہ خلوص کے وہ ٹیٹھے بول، سارے بازار کا ماحول ہی بدلا بدلا نظر آیا۔ گویا ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔ کسی ایک سے اس بابت پوچھتا چھ کرنے کے بجائے میں نے بیساکھی بابا کی جھونپڑی کا رخ کیا۔ ان سے بدلے ہوئے ماحول کی بات کیا چھیڑی کہ بابا حسرت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔ کچھ وقفے سکوت میں گزارنے کے بعد انہوں نے زبان کھولی۔

”مرحوم ڈی، اوشکور صاحب کے داماد ہونے کے
 ناطے تم اس بستی کے بھی داماد ہو پھر تم سے کیا چھپانا۔۔۔
 دراصل پنجاب، آسام اور کشمیر وغیرہ میں رونما ہونے
 والے حالات نے عام لوگوں کے دلوں میں نفرت و
 کدورت کے بیج بودیئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اجمودھیا
 میں ایک عبادت گاہ کو شہید کر کے دوسری عبادت گاہ تعمیر
 کرانے کا ناپاک منصوبہ روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ فرقہ
 وارانہ فسادات میں بہت سے بے گناہ اور معصوم افراد کو
 لقمہ اجل بننا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ حساس لوگوں کے
 دلوں میں بے اعتمادی و گمراہی سامنے لگی۔ لوگ ہر معاملہ
 میں ایک الگ انداز سے سوچنے لگے۔ ارباب اختیار
 فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دے رہے ہیں۔ اب تو اس
 نفسانسی کے عالم میں تو مذہبی، انسانی اور اخلاقی قدروں
 کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں ملتا۔ اس سب کا اثر اپنی
 بستی کے مکینوں نے بھی لیا ہے۔“

کتنی سچائی تھی بابا کی باتوں میں۔ جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک
 دوسرے سے بدظن نظر آئے وہاں بھکاری لوگ اب بھی ایک دوسرے کو دل و جان سے
 چاہتے۔ ان کے درمیان نفرت و کدورت کی دیوار کھڑی نہ ہو سکی۔

پچھلے ہفتہ ایک اچھا خاصہ ہنگامہ دیکھنے کو ملا۔ ہوا یوں کہ ایک فرلانگ سڑک پر

مینار مسجد و جھولے لال مندر کے مابین ایک شراب کی دکان بھی ہے۔ لوگ چاہتے تھے کہ اس سڑک کے تقدس کے پیش نظر شراب کی اس دکان کو ہمیشہ کے لئے بند کروایا جائے۔ مسجد و مندر کے منتظمین نے بھی اس نیک ارادے کو سراہا۔ اسی واقعے کو لیکر کچھ آوارہ فطرت نوجوانوں کے درمیان خاصا جھگڑا ہوا۔ باتوں باتوں میں جھگڑا بڑھ گیا مقامی پولیس کی موجودگی میں چہرے چلے اور نتیجے میں یادو نام کا غنڈہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس کا حریف اکبر بھی زخموں سے چور خون میں لت پت پڑا تھا۔ پولیس نے یادو کی لاش اور اکبر و دیگر زخمیوں کو کوٹور یہ اسپتال پہنچایا۔

اب ہندو مسلم رواداری کی نہج ترک کر کے لوگ ایک دوسرے سے کچھ کچھ رہنے لگے۔ کچھ لوگ اس واقعے کو لیکر جھگڑا بڑھانے کی فکر میں تھے۔ اسی دوران نوجوانوں اور بچوں پر مشتمل ایک گروہ ہاتھوں میں بھالے اور پتھر لئے گلیوں میں احتجاجی گشت کرنے لگا۔

”نعرہ تکبیر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ آواز دو۔۔۔ ہم ایک ہیں۔۔۔“ ”مسلم سے جو ٹکرائے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا۔“

اتنے میں پیپل والی گلی سے اسی طرح کی ایک اور ٹولی برآمد ہوئی۔
 ہر ہر مہادیو۔۔۔۔۔ بے مہاکالی۔“
 تیار کرو جوانوں کو۔۔۔۔۔ بھگادو مسلمانوں کو۔“
 ”بھارت میں گر رہنا ہے۔“
 ”بندے ماترم کہنا ہے۔“

غرض نفرت اور انتقام کا ماحول پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور اس تشویشناک صورت حال کو سنبھالنے کی کسی مولوی، پنڈت، پادری یا گیانی نے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ بس دیوان خانوں یا عبادت گاہوں میں مقید امن و آشتی کے پیغام جاری کرتے رہے۔ کچھ سیاسی شعبہ باز تو ان بگڑے حالات کا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھے تاکہ اس معمولی سے واقعہ کو لے کر سارے شہر میں فساد برپا کر دیا جائے۔

اچانک وکٹوریہ اسپتال سے ملحق گاندھی پارک میں لوگوں نے جمع ہونا شروع کیا۔ پبلک لائبریری سے نکل کر میں بھی لوگوں کی بھیڑ کا ایک حصہ بن گیا۔

اشتعال انگیز فقرے کسے جانے لگے۔ کچھ بزرگ لوگ معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن منافرت سے لبریز ماحول میں خاطر خواہ تبدیلی دیکھنے کی نہیں ملی۔

اتنے میں جبکہ میں بچ بچا کر گھر جانا چاہتا تھا بیساکھی بابا کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔

”کیا ہوا ہے تم لوگوں کو، کیوں معمولی سے معاملے کو

لے کر ایک دوسرے کے جانی دشمن بننے پر تلے ہوئے۔“

نہ جانے بیساکھی بابا کی آواز میں کیا جادو تھا۔ آن واحد میں سب کی زبانوں پر

تالے پڑ گئے۔ ہوا میں لہرانے والے ہاتھ نیچے آ گئے اور لوگوں کے جم غفیر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

”ارے نادانو یہ تو جاننے کی کوشش کرو کہ جھگڑا کس

بات پر ہوا ہے؟ یاد دویا اکبر تو نامی غنڈے ہیں۔ غنڈہ

گردی کرنا ان کا پیشہ ہے۔ کیا تم میں سے اکثر نہیں

جانتے کہ جوا کھیلنا، داروپینا اور راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنا
 ان پر آوازیں کسان جیسے آوارہ صفت لوگوں نے اپنا
 دھرم مان لیا ہے۔ یادو نام کا ہندو تھا۔ جبکہ اکبر نام کا
 مسلمان ہے۔ ان کے لئے تم لوگ اپنے برسوں کے
 خوشگوار تعلقات بگاڑنے کی سوچ رہے ہو۔ بیوقوف بن
 کر مہر و محبت کی پھلواری کو نفرت کی آگ میں جلانے کی یہ
 کوشش بہت مہنگی پڑے گی۔ ہوش کے ناخن لو۔“

بیساکھی بابا کی نصیحت سن کر لوگ سر نیچا کئے چورنگا ہوں سے ایک دوسرے کو
 دیکھنے لگے۔ اتنے میں کسی شریپرست نے تیز دھار والے ہتھیار سے بیساکھی بابا پر حملہ کر دیا۔
 اور خود بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ گویا جب لوگوں میں انتقامی جذبہ مدہم پڑنے لگا تو کرائے
 کے ٹٹو نے ماحول بگاڑنے اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بیساکھی بابا پر
 وحشیانہ حملہ کر دیا۔ اسے بیہوشی کی حالت میں وکٹوریہ اسپتال لایا گیا۔ لوگ سوچنے لگے کہ
 بیساکھی بابا کے مرنے کے بعد اسی بستی کے لوگوں پر نہ جانے کون سی آفت ٹوٹے گی۔ تمام
 لوگ وکٹوریہ اسپتال کے وسیع احاطے میں جمع ہو گئے۔

ادھر بیساکھی بابا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور ادھر مولوی، پنڈت اور
 دیگر مذہبی ٹھیکہ دار دہلی آواز میں اپنی اس خواہش کا اظہار کرنے لگے کہ اگر بیساکھی بابا سدا
 کی نیند سو گئے تو آخری رسومات ان کے مذہب کے مطابق ادا کی جائیں۔ غرض مسلمان
 اور عیسائی چاہتے تھے کہ ان کے بے جان بدن کو ان کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ باقی
 لوگ انہیں نذر آتش کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کو لیکر پھر سے ہنگامہ کھڑا ہونے لگا۔

پنڈت اور گیانی ایک طرف اور پادری و مولوی دوسری طرف۔ ان کے ساتھ بستی کا نوجوان طبقہ خفیہ طریقے پر نفرت کے بیج بونے میں پھر سے مصروف نظر آنے لگا۔
 باتوازن ماحول میں پھر سے کشیدگی سامنے لگی۔ نہ جانے یہ بدلے بدلے حالات کون سا روپ اختیار کر لیتے کہ ڈاکٹر سوکر کی آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”مالک کالا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیساکھی بابا کو جوش آ گیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہیں البتہ خون کافی مقدار میں بہہ جانے کے سبب مزید خون کی ضرورت ہے۔ دس بارہ نوجوان میرے ساتھ اندر آ جائیں۔ مناسب مقدار میں خون جسم میں داخل ہونے کے بعد بیساکھی بابا بہت جلد صحت یاب ہو سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر کی بات سن کر لوگوں میں سر اسمگی پھیل گئی۔ پنڈت، پادری، مولوی و گیانی جی ایک ایک کر کے احاطے سے باہر آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے بیساکھی بابا کو ٹوٹ کر چاہنے والے اکثر افراد ایسے غائب ہو گئے کہ جیسے وہ انہیں جانتے بھی نہ ہوں۔

البتہ رحیم، اوتار، رام داس، فرنا ڈیز اور بھیکو وغیرہ بھکاریوں کی ٹولی جی رہی اور وہ سب بھرپور خلوص نیک جذبے کے ساتھ ہسپتال کے اندر چلے گئے۔ اپنے ہم پیشہ ساتھی ”بیساکھی بابا“ کی زندگی بچانے کی لگن میں۔ انسانیت ان کا دھرم ہے اور رواداری ان کا مذہب۔۔۔ اور۔۔۔ وہ۔۔۔ ایک انسان کو بچانا چاہتے تھے وہ بھی انسانیت کے ناطے۔



ملاپ

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ آن کی آن میں آسمان کی وسعتوں میں
کالے بادل چھانے لگے اور بجلی کی کڑک نے رات کو اور بھی خوفناک بنا دیا۔ آندھی اور
طوفان میں مقید رات، ہر طرف اندھیرا اور سناٹا، وحشت ناک خاموشی ہر سو چھانے لگی۔
الغرض رات ایک نئی نویلی بیوہ کی طرح سیاہ لبادہ اوڑھے اور بال کھولے کراہ رہی تھی۔

عاصفہ بھی ایک بیوہ تھی

اُس کا کوئی پرسان حال نہ تھا

آج لگا تار کئی دنوں سے عاصفہ بستر مرگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ درد
سے کراہ رہی تھی

اُس میں اٹھنے کی طاقت نہ تھی

ایک اکیلا ننھا سا سہارا راکب اس کی گود سے چپان سوراہا تھا۔ زبردست آندھی
کے شور نے راکب کی نیند اُچاٹ کر دی۔ وہ مارے خوف کے تھر تھرا اٹھا۔ اُس کے منہ سے
نکلا

”ماں“

بدلے میں عاصفہ نے اُس کے معصوم بدن پر اپنا لاغر ہاتھ پھیرا اور راکب سہمے

ہوئے پرندے کی مانند خاموش ہو گیا۔ ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کی نیت سے عاصفہ بصد مشکل چارپائی سے اٹھی۔۔۔ آہستہ آہستہ بلکہ گرتے ہوئے کھڑکی تک پہنچی اور اُس کے گھلے پٹ بند کر دیئے۔ واپس مڑی تو کسی چیز سے ٹھوکر کھا کے فرش پر ایسے گری کہ پھر اٹھ نہ سکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے تیز جھونکے نے کھڑکی کے پٹ پھر سے کھول دیئے اور طاق پر رکھا ٹمٹا تا چراغ بجھ گیا۔ بے بسی کے عالم میں عاصفہ ہمیشہ کی نیند سو گئی اور راکب کو بے آسرا چھوڑ گئی۔

راکب بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اُس کے منہ پر تھپڑ مار کر جگادیا۔

”ماں! تم کہاں ہو ماں۔“ راکب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اتنے میں بجلی اس انداز سے چمکی کہ اُس کی روشنی میں راکب کی نظر ماں پر پڑ گئی جو اوندھے منہ بے حس فرش پر پڑی تھی۔ اُس نے ماں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرتے ہوئے کہا۔

”اٹھو ماں! مجھے ڈر لگتا ہے، اٹھتی کیوں نہیں ہو ماں!

میں راکب ہوں، تمہارا بیٹا، ماں کیا مجھ سے روٹھ گئی ہو۔

میں اب دودھ نہیں مانگوں گا۔ میں تنگ بھی نہیں کروں

گا۔۔۔ مگر اب تم اٹھو ماں۔۔۔“

راکب روتا رہا۔ بکلی کڑکتی رہی اور ماں کا بے جان جسم کھر دے فرش پر پڑا رہا۔ ساتھ ساتھ دنیا کے رکھوالے پُپ چاپ تماشہ دیکھنے میں محو تھے۔

اگلے روز عاصفہ کی تجہیز و تکفین کے بعد راکب کو اُس کے چچا اپنے گھر لے آئے۔ رشید میاں محکمہ آبپاشی میں ملازم تھے اور اپنی بیوی عابدہ کی شرکت میں زندگی اچھے انداز سے کٹ رہی تھی۔ رشید میاں کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی جس کا اُسے اُس کی بیگم عابدہ کو

کافی دکھ تھا۔ آستانوں پر ناک رگڑنے، خانقاہوں پر نیاز چڑھانے اور پیر فقیروں کی دُجوئی کرنے پر بھی چھ برس گزرنے کے بعد بھی اُن کی مُراد بر نہ آئی۔ عابدہ چھوڑ رشید نے بھی اولاد کی کمی کو کئی بار شدت سے محسوس کیا لیکن اس کی کوپور کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

”جانے اولاد کی صورت دیکھنا نصیب بھی ہوگی یا نہیں۔“

کیوں نہ راکب کو ہی اولاد کا درجہ دیا جائے۔“

اس خیال کو دل و ذہن میں بسائے رشید میاں راکب کو اپنے گھر لایا تھا۔ راکب کو اس نئے گھر میں ہر طرح کا سکھ و آرام ملا۔ اور اِس آسائش و راحت کے باعث راکب اپنی ماں کی یاد کو کسی حد تک فراموش کر بیٹھا۔ پیار و انیت کے عالم میں غرق راکب تعلیم و تربیت کے میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔

کئی بہاریں آئیں اور چلی گئیں۔۔۔ زندگی کا سفر جاری رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راکب کے دل میں چاچا اور چاچی کے لئے محبت و احترام کی شمعیں روشن ہوتی گئیں۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ راکب نے میٹرک کا امتحان اینتازی نمبرات کے ساتھ پاس کر لیا۔ وہ مستقبل کے تانے بانے بننے میں مشغول تھا کہ یہ مژدہ سُنے کو ملا کہ اُس کی چاچی عابدہ برسوں بعد ماں بننے کی دہلیز کو چھونے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اُس کردگار نے اپنے فیض و کرم سے عابدہ کو چاند سا بیٹا عطا کیا۔ اِس خوشی کو دو چند کرنے کی خاطر رشید میاں نے بڑے پیمانے پر احباب کی دعوت کا اہتمام کیا۔۔۔ کوشی کا وسطی ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ قہقہوں اور مسرت آمیز باتوں سے سارا ہال گونج رہا تھا۔ اِس خوشی کے

ماحول میں راکب بھی برابر میزبان کی حیثیت سے ہر ایک سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آتا رہا۔ دراصل وہ بھی خوش تھا کہ بدلتوں بعد اُسے بھائی ملا ہے چھوٹا بھائی۔ مہمانوں سے منہنے کے بعد راکب نے خوشی و انبساط میں سرشار معصوم کو پیار کرنے کی غرض سے گود میں اٹھالیا۔

”اے گرا دے گا میرے ننھے کو“

عابدہ نے بدلے بدلے انداز کے ساتھ بچے کو راکب کی گود سے کیا لیا کہ راکب دیکھتا رہ گیا۔ موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے اُس نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔

کافی رات گئے تک اڑوس پڑوس کی عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر خوشی کے گیت گاتی رہیں۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ عابدہ کو قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔ بھرپور انداز میں مسرت و شاذمانی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ راکب ان لوازمات سے دامن بچائے چھوٹے ڈالان کے گوشہ راست میں بیٹھے اپنے آنے والے کل کی بابت سوچ رہا تھا۔ صبح صادق مولوی تمیز الدین بچے کا نام رکھنے والی رسم میں شرکت کرنے بلائے گئے۔ اور بچے کا نام آفتاب احمد رکھا گیا۔

آفتاب کی پرورش خوب ناز کے ساتھ کی گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ کا پیار آفتاب کے لئے بڑھتا گیا اور خلاف توقع راکب کے ساتھ ناروا سلوک اپنایا جانے لگا۔

اے احتجاج بلند کرنے یا داویلا سے کام لینے کے بجائے راکب نے چُپ سادھے حالات کا جائزہ لینا ہی مناسب جان لیا۔ خاموش رہ کر وہ اسے آپ کو سمجھانے لگا

کہ آفتاب چاچا چاچی کا اپنا خون ہے اس لئے اُس کے ساتھ اُن کا محبت جتنا ایک قدرتی امر ٹھہرا۔ میں آخر کار پرایا ہوں۔“ اب تو اس گھر میں توجہ کا مرکز فقط اور فقط آفتاب تھا۔ راکب کے ساتھ کھلے دل سے تبادلہ خیال کرنا تو دُور اُس کی خیر و خبر لینے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی۔

ادھر راکب ایک ایک قدم بھونک بھونک کر اٹھانے لگا اور ادھر چاچی عہد کر بیٹھی تھی کہ راکب اور اُس کے چاچے کے درمیان نفرت و کدورت کی دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اب تو معمول بن چکا تھا کہ رشید میاں گھر میں قدم رکھتے تو راکب کی نسبت نہ جانے کیا کچھ سُنا پڑتا تھا۔ پہلے پہل رشید نے عابدہ کی باتوں پر کان نہیں دھرا مگر لحظہ بہ لحظہ اُس کے دل میں راکب کی بابت بدگمانی نے گھر کر ہی لیا۔

آج جب رشید میاں کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد گھر لوٹے تو عابدہ نے حسبِ عادت ترکش سے ایک اور تیر پھینکا۔

”اب اس گھر میں راکب رہے گا یا میں“

”ایسی کون سے بات ہو گئی عابدہ“۔ رشید نے پوچھا

”کیا بتاؤں“۔ عابدہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں

”یہ کل ہی کہ بات ہے کہ راکب نے مجھ سے پچاس روپے مانگے۔ میری

جیب اُس وقت خالی تھی۔ میں نے انکار کیا تو مُنہ زوری پر اُتر آیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ طرح طرح کہ صلواتیں سُنا تے ہوئے مارنے کی دھمکی تک دے گیا۔ گالیاں دیتے ہوئے گھر سے نکلا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ سنا ہے اب سگریٹ بھی پینے لگا ہے۔“

عابدہ راکب کی نسبت شکایات کا پلندہ کھولے رشید کے چہرے کا جائزہ لینے لگی

”چا چا جی! یہ سب جھوٹ ہے“

”کینے تو جو کہے وہ سچ۔۔ اور تمہاری چا چی کہے وہ لغو اور

بکواس۔۔ بے غیرت کہیں کے دوز ہو جاؤ میری نظروں

سے۔“

چا چا کو غصے میں لال پیلا ہوتے دیکھ کر راکب سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بگڑے ماحول میں زیادہ ارتعاش پیدا ہو۔ وہ اپنی قسمت کو کون سے لگا۔ افسردہ حالات میں اُس کی توجہ تعلیم سے ہٹنے لگی۔ اور جب بی اے کا نتیجہ نکلا تو راکب کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

عابدہ نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور ایک تیر ترش سے نکالا۔

”اجی ایسے آوارہ صفت لڑکے بھی کہیں پاس ہوتے ہیں جو دن بھر در بدری کرتے ہیں، بچا کھیلتے ہیں اور شام کو بغل میں کتابیں دبائے گھر آ جاتے ہیں۔“

اس بار عابدہ کا تیر خالی نہیں گیا۔ رشید بھی عابدہ کی تائید کرتے ہوئے بے زُنی

کے ساتھ راکب پر برس پڑا۔

تیرے ماں باپ میرے پاس بھری تجوری نہیں چھوڑ گئے

تھے جو تم رقم اڑاتے پھرو۔ ہم نے تمہاری ساری زندگی کا

ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے کہ تمہارے ناز نخرے برداشت

کرتے رہیں۔ تم اپنی من مانی کرتے رہو۔ غور سے سُن لو

اس گھر میں رہنا ہے تو کچھ کما کے لاؤ۔ آخر کب تک

مُفت کی روٹیاں توڑتا رہے گا۔“

آج تک راکب نے خاموش رہ کر چاچی کے ظلم و ستم سہہ لئے تھے مگر اب چاچا کی زبان سے خُرش و کرخت الفاظ سُن کر اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کمرے میں گھس چار پائی پر اُوندھے مُنہ گر پڑا۔ اپنی بدبختی پر زار زار رونے لگا۔ گھناؤنے مستقبل کا غم زدہ نقشہ آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا۔

راکب افراتفری کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی دوران ماں کی یاد ستانے لگی۔ وہ عالم اضطراب میں بڑبڑایا۔

”ماں! کیا تمہیں بھی میری بے کسی پر رحم نہیں آتا مجھے

اپنے پاس بلا لو ماں۔ اس دنیا سے اٹھا لو جہاں قدم قدم

پر مکاری اور دغا بازی اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہے“

راکب سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس کے برعکس رشید میاں اور عابدہ آفتاب کے

مستقبل کو درخشاں بنانے کی بابت سوچ رہے تھے۔ بازو والے کمرہ میں آفتاب بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔

رات صبح کے انتظار میں بوڑھی ہوتی گئی۔

صبح سویرے آفتاب دوڑتا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اُس کی جانب کاغذ کا داغدار ٹکڑا

بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ لوں ماں بھیا کی چھٹی، یہ بھیا اپنے بستر پر رکھ کر نہ

جانے کہاں چلے گئے ہیں۔

عابدہ نے چھٹی رشید میاں کی جانب بڑھادی اور آفتاب کو خاموش رہنے کا اشارہ

کردیا۔ رشید نے چھٹی پڑھنا شروع کی:

”مجھ پر یہ اصلیت اب آشکار ہو چکی ہے کہ میرا وجود آپ لوگوں کے لئے بوجھ کا روپ دہار چکا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ آپ میری وجہ سے خواہ مخواہ پریشان ہوں۔ میں آپ لوگوں کے لئے مزید بوجھ یا پریشانی کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ اس لئے ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔۔۔ کہاں۔۔۔ یہ نہیں جانتا۔ مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہو تو معاف کرنا۔“

آپ کا راکب

”یہ سب تیری وجہ سے ہوا عابدہ“ رشید نے کہا اور عابدہ اپنے کئے پر پچھتائے کے بجائے برجستہ کہہ گئی۔

”جانے والا تو چلا گیا۔ اب بے کار جھگڑنے سے کیا حاصل۔“ اور رشید خیالوں میں کھو گیا۔

راکب دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے کو چیرتا چلا جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ اُس کی حالت پر کئے پرندے سے کسی طور کم نہ تھی۔ اُس کی حسرتوں و اُمنگوں کا خون ہوا تھا۔ اور اِن مُردہ اُمنگوں کی لاش کا ندھے پر اُٹھائے شہر شہر گھومتا رہا۔ تھک ہار کر اُس نے بڑی ندی کا رُخ کیا اس خیال کو دل میں بسائے کہ دریا میں کود کر زندگی کا خاتمہ کر دے۔ رات گئے اپنے حال میں مست بڑی ندی کے آہنی پل پر پہنچتے ہی اُس کے کانوں میں آواز پڑی ”ہالٹ“

راکب ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ دوسرے لمحے اُس کے قدم اُٹھے تو ”ہالٹ“ خبردار آگے مت بڑھو۔“ کی کرخت آواز سُنائی دی۔ راکب نے ادھر ادھر جھانکا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ دفعتاً پل کے وسط میں ایک شور مچا ہوا۔ بندوق کی گولیاں شائیں شائیں کرتی گزرنے لگیں۔ راکب دم بخود رہ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھا اُس نے آگے بڑھنا چاہا۔ مشکل سے کچھ قدم بڑھا تھا کہ ایک گولی راکب کے بائیں بازو میں لگی اور وہ خوف و ہراس کے مارے وہیں گر پڑا۔ دوسرے دن اخبارات میں یہ خبر کلیدی طور چھپ گئی کہ ”تخریب کار جماعت کی طرف سے بڑی ندی کا پل اڑا دینے کی سازش ناکام بنا دی گئی۔ دوسرا ششی موقع پر مارے گئے اور تین کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ فوجی ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔“

راکب کو ہوش آیا تو بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی دفعتاً نرس چلائی۔
 ”اُٹھئے مت! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“

یہ کہتے ہوئے نرس نے راکب کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ راکب نے نازک انگلیوں کا لمس محسوس کیا اور غیر ارادی طور اپنا ہاتھ نرس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”تمہارا نام کیا ہے۔۔۔“ ”گلبدن“ نرس نے کہا۔

گُل بدن دراصل محکمہ سراغ رسانی سے وابستہ تھی اور مقامی ملحدی ہسپتال میں نرس کے طور کام کر رہی تھی۔ راکب کی بابت اصلیت جاننے کی غرض سے وہ راکب کے ساتھ گھل مل گئی۔ وہ ہدایت کے تحت کام کر رہی تھی۔ نیپر پیچر ریکارڈ کرنے کے بعد ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

”آپ کا نام“

”جی! میرا نام مرچکا ہے“

”نام مرچکا ہے۔ کیا معنی۔“ یہ گل بدن تھی۔

”ہاں ہاں میرا نام مرچکا ہے۔ میری حالت ایک زندہ

لاش سے کم نہیں۔۔۔ ویسے مجھے راکب کہتے ہیں۔“

”نام اچھا ہے مگر کام تو تباہی و بربادی سے لبریز۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو گل بدن“

”آپ رات کے اندھیرے میں پل اڑانے کی حرکت

کرتے پکڑے گئے۔“

آخر گل بدن نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

”میں پل اڑانے میں ملوث۔“ راکب حیرانی کا مجسمہ بن کر کہنے لگا۔

”ہاں آپ بھی دہشت گردوں میں شامل تھے۔ پولیس

رپورٹ میں یہی کچھ درج ہے۔ دلش کی بربادی سے

آپ لوگوں کو کیا حاصل ہوتا ہے۔“

گل بدن ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

”لیکن یقین کر لو! میں پل اڑانے نہیں گیا تھا۔ سچ تو یہ

ہے گل بدن کہ میں اپنی زندگی کا پل اڑانے گیا تھا۔“

”زندگی کا پل۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو

مجھے نہیں سناؤ گے اپنی کہانی“ گل بدن اصلیت جاننے کی چاہ میں کہہ گئی۔

”بلاوجہ گذرے دنوں کی یاد تازہ ہو جائے گی۔“

چھوڑو! ان گذری باتوں کو جن میں درد و کوفت کے سوا کچھ نہیں،
بدلے میں گل بدن نے اپنائیت کے انداز میں اصرار کیا کہ راکب انکار نہ
کر سکا۔

راکب اپنی کتاب زیت کا ایک ایک ورق اُلٹا گیا اور گل بدن سنتے سنتے
اچانک چیخ پڑی۔

”بس کرو راکب، بہت دکھ اٹھائے ہیں تم نے مجھ سے سُنا نہیں جاتا۔“
راکب خاموش ہو گیا۔ اور کچھ توقف کے بعد گل بدن بول اُٹھی
”لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ پریشانیوں سے تنگ
آ کر خودکشی کی بابت سوچا جائے۔ پریشانیوں سے تنگ
آ کر فرار کا راستہ اختیار کرنا تو بزدلوں کا کام ہے۔“

جواب میں دونوں ایک دوسرے کو اُلٹ بھری نظروں سے گھورنے لگے۔

راکب کی تمارداری میں گل بدن نے دن رات ایک کئے۔ اُن کی بے لوث
ہمدردی نے راکب کو سرعت کے ساتھ تندرست کر دیا۔ گل بدن کی رپورٹ پر دیگر دو
پکڑے گئے افراد کے بیانات کے بموجب راکب کی بابت اصلیت جان کے پولیس نے
اُسے بری کر دیا۔ لیکن گل بدن کے چنگل سے اُسے آزادی نہ مل سکی۔ ہسپتال سے چٹھی لیکر
وہ راکب کو اپنے سرکاری کوارٹر میں لے آئی۔ جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔
راکب گزشتہ واقعات سے قطع تعلق محبت کی چھوٹی سی دنیا آباد کرنے کی بابت سوچنے لگا۔

ماں کی رضامندی حاصل کئے گل بدن اور راکب شادی کے بندھن میں بندھ
گئے۔ اور خوشی خوشی زندگی گزارنے کے سنے دیکھنے لگے۔۔۔ گل بدن کی کوششوں کی

بدولت راکب دو سالہ تربیتی کورس مکمل کر کے اسٹیٹ ہسپتال میں ملازمت کرنے لگا۔
 راکب کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی۔ ٹھیک کہا ہے داناؤں نے کہ ڈراونی اندھیری رات کے بعد
 فرحت بخش سویرا نمودار ہو ہی جاتا ہے۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ گل بدن اور راکب کی پھلکاری میں دو کلیوں کا اضافہ
 ہوا۔ راکب کو شریک حیات، ماں اور دو بچیوں کی رفاقت کیا حاصل ہوئی مانو دنیا بھر کی
 خوشیاں ہاتھ آگئیں۔

ایک شام ڈیوٹی سے فارغ ہو کر راکب بلڈ بینک سے وابستہ کمرہ بند کر رہا تھا کہ
 مانوس آواز نے کانوں کے پردے ہلا دئے

”مجھ دکھیا ری پر رحم کھاؤ بابو۔ اگر خون دستیاب نہ ہو تو

میرا بیٹا سدا کے لئے مجھے چھوڑ کر جائے گا۔ کسی نہ کسی

طرح خون فراہم کر دیجئے۔“

”چاچی“ راکب سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے ساتھی توفیق سے ہمکلام اپنی
 چاچی کو پہچان لیا تھا۔

عابدہ نے اپنی کمزور آنکھوں کو اوپر اٹھایا اور راکب سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ
 کر رونے لگی۔

”بیٹا! تمہارا بھائی آفتاب مرنے کو ہے اُسے خون کی

ضرورت ہے مجھ نصیبوں جلی پر رحم کھاؤ۔“

راکب نے چاچی کے ہاتھ سے ٹکٹ لے لی۔ ادبہ آفتاب کا اکیڈنٹ ہوا ہے،
 خون کا گروپ دیکھ کر اُسے مایوسی ہوئی کیونکہ اس گروپ کا خون سردست دستیاب نہ تھا۔

راکب نے چاچی کو آفتاب کے بیڈ کے پاس بٹھایا اور خود ڈاکٹر رمضان کے پاس چلا گیا۔
اپنے خون کا ٹیسٹ کرایا۔ اطمینان کا سانس لیا جب گروپ مل گیا۔

اپنی رگوں میں سے خون نچوڑ کر آفتاب کی نیم جان نٹوں کی نذر کرادیا۔ راکب
آج کتنا خوش تھا کہ کم از کم پروردگار نے اُسے احسانوں کا بدلہ چکانے کا موقع بخشا۔
راکب کی قربانی رنگ لائی اور اُس کے خون کی بدولت آفتاب کی جان بچ گئی۔
راکب نے گل بدن کی شرکت میں آفتاب کی تیار داری دل و جان سے کی۔ اور وہ وقت بھی
آیا جب آفتاب تندرست ہو کے ہسپتال چھوڑتے وقت اپنے بھائی کے پاؤں پر ڈھیر ہوا
اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

”بھیا! ہمیں معاف کر دو! ہم نے آپ کو ہر قدم پر ڈکھ
سے نوازا۔ آپ کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ اور اس کا
معاف آپ نے کس اپنائیت سے چُکایا۔ ہمیں معاف
کرنا بھیا۔“

”ارے بچے میں نے تو اپنا فرض ادا کیا۔“ راکب
برجستہ کہہ گیا اور آفتاب کو قدموں سے اٹھا کے گلے سے
لگا لیا۔ دونوں بھائی فرط مسرت میں رونے لگے۔ عابدہ
سامنے کھڑی تھی۔

اپنے کئے پر نادم و شرم سار۔۔۔!

اُس نے راکب کو اپنائیت بھرے انداز میں گلے لگا لیا۔ اور گلوگیر آواز میں گویا

ہوئی۔

”بیٹے راکب ہو سکے تو مجھ گناہ گار کو معاف کر دینا۔ ویسے
 تم معاف بھی کر دو۔ پھر بھی میں جانتی ہوں کہ اللہ پاک
 مجھے معاف نہیں کریں گے۔ میں نے تم پر کتنے ظلم ڈھائے
 بیٹے! تمہارے ساتھ ساتھ مجھ چڑیل صفت نے تمہارے
 چاچا اور اپنے رفیق زندگی پر بھی جفا کی۔۔۔ میری تنگ
 دلی، اور کوتاہ نظری سے تنگ آ کر وہ اس دنیا سے سدا کے
 لئے منہ موڑ کر چلے گئے۔ کاش مجھے موت آ جاتی۔
 کاش۔۔۔۔“

چاچی! دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔
 قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

راکب کے بجائے گل بدن نے عابدہ کو تسلی دی اور پھر سب کے سب ہسپتال
 سے نکل کر ایک نئی مگر خوشگوار منزل کی جانب چل پڑے۔۔۔ نئی منزل۔۔۔ اپنائیت و
 انسیت سے لبریز منزل۔۔۔۔۔



امانت

تنویر اور اُس کی چھوٹی بہن ساجدہ شہر کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے والد الطاف نواز اسی سال چیف انجینئر کے ممتاز عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور ماں مقامی گرلز ہائی اسکول میں بحیثیت ہیڈ ٹیچر فرائض انجام دے رہی تھی۔ الطاف نواز کی دلی خواہش تھی کہ تنویر بھی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر لے لیکن تنویر کو اس شعبے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ بلکہ وہ پڑھ لکھ کر ماں کی طرح ایک معلم بننا چاہتا تھا۔ ادب اور ثقافت کی جانب اُس کا رجحان زیادہ تھا۔ الغرض والد کی آرزو کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے تنویر ادبی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ بڑھنے لگا۔

شہر کے وسط میں جہلم کے کنارے الطاف نواز کا تین منزلہ شاندار بنگلہ تھا۔ زیریں منزل میں مہمان خانہ، بڑا ہال، اسٹور روم اور رسوائی گھر کے علاوہ تنویر و ساجدہ کے کمرے بھی تھے۔ پہلی منزل میں والدین اور دیرینہ نوکر رحیم چاچا قیام پذیر تھے۔ رحیم چاچا بچپن سے اس گھر سے وابستہ تھا اور اس کبرسی میں وہ تنویر کے والدین کا چھوٹا موٹا کام کیا کرتا تھا۔ ساجدہ رسوائی گھر میں ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ البتہ کالج میں داخلہ لینے کے بعد اُسے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرنا پڑتا۔ ادھر کچھ مہینوں سے بیگم الطاف کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا۔ اُس نے چاہا کہ تنویر کے ازدواج کا بندوبست کیا جائے تاکہ بہو گھر میں آئے اور اُس کا ہاتھ بٹائے۔ اسی دوران الطاف نواز کے یار غار ابراہیم خواجہ ڈوڈہ سے تشریف لائے اور اُن کے ہاں کچھ روز ٹھہرے۔ دراصل الطاف نواز اور

ابراہیم خواجہ نے اکٹھے بنگلہ سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ باتوں باتوں میں ابراہیم خواجہ نے اپنی بیٹی آرفین کا قصہ چھیڑا جو ایجوکیشن میں ایم اے کر رہی تھی۔ الطاف نواز بھی چاہتے تھے کہ برسوں کی دوستی رشتہ داری میں بدل جائے۔۔۔ لیکن تنویر کو شادی سے جیسے خدا لگتا بیر تھا۔ اُس نے جم کر مخالفانہ رویہ اپنا کر سب کو مایوس کر دیا۔ الطاف نواز پہلے ہی ناراض کہ انجینئرنگ نہ پڑھ کے زبان و ادب کا متوالا بنا اور اب اُس کے جگری دوست کی بیٹی کا رشتہ نامنظور کر کے اُسے رنجیدہ کر دیا۔ تنویر اپنے والدین کا سامنا کرنے سے بھی کتراتا تھا۔

”بھیا شادی کے لئے ہاں کر دو۔۔۔ پاپا اُمی کی خواہش کا احترام کئے اُن کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ آج نہیں تو کل شادی کرنی ہی پڑے گی۔ پھر یہ ہٹ دھرمی کس لئے۔“

یہ بات ساجدہ نے اپنا تیت بھرے لہجے میں کہہ دی۔
 ”بہن! شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔
 میں چاہتا ہوں کہ اپنا سارا دھیان پڑھائی کی طرف دوں
 میں ایک معتبر ادیب بننا چاہتا ہوں۔۔۔ ایک کہانی کار
 کے طور اپنی شناخت چاہتا ہوں۔ ابھی شادی کی بابت
 سوچنا بھی عبث ٹھہرا۔“

اسی دوران بنگلہ کے صدر دروازہ پر دستک ہوئی۔

تنویر نے دروازہ کھولا۔ نظر اٹھائی تو ایک جوان لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ صورت

و شکل سے پنجابن لگتی تھی۔ گندی سی شلوار، میلا سا کرتہ سر پر چادر بھی کوئی صاف نہیں تھی۔
اُس کا حسن مصیبتوں کے گرد و غبار سے مدہم پڑ چکا تھا۔ جیسے چاند بادل کی آڑ میں چھپ
جائے۔ لڑکی نے نہایت ادب سے سلام بجالایا۔

تنویر نے ساجدہ کی طرف اشارہ کیا
ساجدہ نے اُسے اپنے قریب بلایا اور پوچھا
”کیا چاہتی ہیں آپ؟“

”کوئی کام“

”کیسا کام“

”گھر میں کوئی کام ہو۔ کھانا بنانے کا،

جھاڑو لگانے کا۔ حضور کے بچوں کی

نگہداشت کا اور جو بھی کام ہو“

”پرا بھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی، مسکرا کر ساجدہ نے کہا

”خدا کو منظور ہوا ہو جائیگی۔ تب تک میں آپ

لوگوں کی خدمت بجالاؤں گی۔ اور سرکاری بھی“

اتنا کہہ کے تنویر کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ کون ہیں؟“ ساجدہ نے پوچھا

”حضور کے سرکار“

”نہیں یہ میرے بڑے بھائی تنویر احمد ہیں“

”معاف کرنا میں کچھ اور ہی سمجھی تھی“

تمہارا نام کیا ہے؟“ ساجدہ کی رگ تجس جاگ اٹھی۔

”میرا نام مہرو ہے“

”کہاں رہتی ہو؟“

گاؤں کی ہوں، بوڑھے والد کے ساتھ رہتی ہوں“

”کچھ پڑھی لکھی ہو؟“ اب تنویر نے پوچھا

”تھوڑا سا“

الغرض والدین ورجیم چاچا کی رضامندی حاصل کئے مہرو کو گھریلو کام کاج کے لئے رکھا گیا۔ اسٹور روم کے ملحق اُسے کمرہ ملا۔ ساجدہ نے اپنے پرانے مگر صاف سترے اور دھلے کپڑے مہرو کو پہننے کے لئے دئے۔ وہ جب صاف ستھری ہو کر صبح سویرے تنویر کے کمرے کو صاف کرنے لگی اُس نے دروازہ کی دراز سے جھانک کر کمرے کا جائزہ لیا۔ تنویر ابھی سو رہا تھا۔ وہ دروازہ کے پاس خاموش کھڑی رہی۔ پھر آہستہ سے کمرہ کا دروازہ کھولا اور جھاڑو لگانے لگی۔ جھاڑو کی آواز سے تنویر کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

”ساجدہ کیا ہے؟“ اور اُسے جواب ملا

”سرکار ساجدہ نہیں۔ آپ کی نوکرانی ہے“

تنویر نے آنکھیں کھولیں، ایک خوبصورت سی شرمیلی شرمیلی لڑکی نگاہیں نیچی کئے ہوئے کھڑی تھی۔

تنویر نے بھرپور نظر اُس کے چہرے پر ڈالی اور دیکھتا رہ گیا۔

”سرکار آپ آرام کیجئے! میں آہستہ آہستہ کمرہ صاف کر لوں گی“

اور پھر اُس نے کمرہ صاف کر دیا۔۔۔ میز کی چادر اٹھا کر جھاڑ دی۔ اور شلف پر کتابیں قرینے سے لگا دیں۔ پھر اُس کا آئینہ اپنے پلو سے صاف کیا۔ چھوٹی میز تنویر کے پلنگ کے پاس لگا دی اُس پر شیونگ سامان جمادیا۔

”میں پندرہ منٹ میں چائے لاؤں گی“

یہ کہہ کر مہر و مہمان خانہ کی صفائی کرنے لگی۔ میز گریساں اور صوفہ سیٹ وغیرہ از سر نو طریقے سے جمادیں۔

کمرے اور ہال کی آرائش دیکھ کر تنویر کا سر چکرانے لگا۔

”مہرو! میں تو تمہاری سلیقہ مندی اور صفائی دیکھ کر دنگ ہوں“

”کیا آپ میرے کام سے خوش ہیں؟“

”ہاں مہرو“

”یہ میری خوش قسمتی ہے، کوشش کروں گی کہ بڑے

صاحب اور ساجدہ جی کو بھی میرا کام پسند آئے۔“

اتنے میں ساجدہ کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی صفائی اور طریقے سے رکھی گئی چیزیں دیکھ کر واقعی خوش تھی۔

مہر و چائے لیکر آئی اور ٹی پائی پر رکھ کر چلی گئی۔

”ساجدہ! کیا مہر و ہمارے ساتھ چائے نہیں پی سکتی“

”کیوں نہیں وہ تو سلیقہ شعار لڑکی ہے۔ البتہ ماں اور پاپا کو

یہ سب پسند نہیں آئے گا۔ ہم لوگوں کو البتہ کوئی اعتراض

نہیں ہونا چاہیے۔“

دونوں نے چائے نہیں پی۔ وہ مہرو کا انتظار کرنے لگے۔ مہر و آئی تو اُس نے دیکھا چائے ویسے ہی رکھی ہے۔

ساجدہ نے کہا

”مہرو ہمارے یہاں کا قاعدہ ہے کہ چائے نوکر خود تیار کرتا ہے“

مہرو نے چائے بنائی، پیالے دو ہی تھے۔

”ایک پیالہ اور لے آؤ“ ساجدہ نے کہا

مہرو دوڑتی گئی اور ایک پیالہ لے آئی۔ اُس میں بھی ساجدہ نے چائے

انڈیل دی اور مہرو سے کہا

”اس کرسی پر بیٹھو مہرو“ وہ کھڑی ہی رہی۔

ساجدہ نے تب تنویر سے انگریزی میں کہا کہ آپ ہی اسے سمجھا دیں۔

”مہرو! ساجدہ بہن چاہتی ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ

چائے پیو، وہ تمہارے کام سے بہت خوش ہے۔ تم قریب

قریب اُن کی عمر کی ہو۔ اُن کی سہیلی کی طرح اس لئے وہ

تمہیں نوکر نہ سمجھ کر سہیلی کا درجہ دینا چاہتی ہے۔ ٹھیک ہے

نا۔“

ساجدہ نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی مہرو کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیرنے

لگے۔ اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اٹھ کھڑی ہو گئی اور مہرو کو اپنے سینے سے لگا لیا۔۔۔

”مہرو تم سہیلی نہیں بلکہ میری بہن ہو۔ ماں پاپا الگ خیالات کے لوگ ہیں۔ اُن

کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پر ہمارے لئے تم نوکر نہیں ہو۔ تم ہمارے ساتھ بیٹھ کر

چائے پیو گی۔ اور کھانا بھی ساتھ ہی کھاؤ گی۔“ ساجدہ کا لہجہ اپنائیت سے لبریز تھا۔

”بہن جی! خاک کا ذرہ ہوا کے جھونکے سے اُوپر اُڑ کر

چاہئے جتنی بلندی پر پہنچ جائے پر ہوا کا زور کم ہونے پر وہ

نیچے کی طرف ہی گرے گا اور گر کر خاک میں مل جائے

گا۔ مہر و آپ کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی۔“

بدلے میں ساجدہ نے اُس کے دائیں گال میں ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے

کہا:

”چل چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ بڑی پڑھی لکھی بن رہی

ہے۔ چائے پی لے ابھی پایا کام کے لئے بلائینگے۔“

”اُن کو اور رحیم چا چا کو میں نے چائے دی ہے“ یہ مہر و تھی، مہر و نے چپکے سے

چائے پی اور پھر چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ تب تنویر نے زبان وا کر دی۔

”مہر و نے کس قدر وزنی بات کہی ہے۔ تم نے سمجھا کچھ! ایک فلسفی کی طرح

بات کرتی ہے۔“

”یہ تو انفریاریٹی کمپلیکس ہے“ ساجدہ نے لقمہ دیا

”میرا خیال ہے کہ وہ بہت مصیبت زدہ ہے۔ کیونکہ میں

نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو رہتے

ہیں۔ ہم لوگوں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُس کے دل سے

یہ احساس کمتری کسی طرح سے نکل جائے۔“ یہ تنویر تھا۔

”میں اس معاملے میں ہر امکانی مدد کرنے کی کوشش

کروں گی۔ مگر پس پردہ! کیونکہ پاپا اور مئی تو اسے نوکر ہی
خیال کرتے ہیں۔“

کچھ ہفتے ہی گزرے تھے کہ ساجدہ کو یہ احساس ہونے لگا کہ مہرو ایک خاندانی
فرد کی طرح گھر کے معاملات میں دل چسپی دکھانے لگی اور یہ بھی خوش آئیند بات کہ تنویر
کے خیالات میں عورت ذات کی بابت خُرش روی میں بڑا فرق پڑا۔ ساجدہ دل ہی دل میں
مہرو کو دعائیں دینے لگیں کہ اُس کی سلیقہ شعاری اور ادب نوازی نے اُس کے بھائی میں
ایک خوش گوار تبدیلی لائی۔

صبح جب مہرو چائے بنانے لگی تو پاپا نے آواز دی وہ دوڑی گئی۔۔۔ دراصل وہ
پاپا کی میز پر تازہ پھولوں کا گلہ دستہ رکھنا بھول گئی تھی۔ پاپا اُسے ڈانٹ رہے تھے۔ اور وہ
سک سک کر زور رہی تھی۔

”حضور کل سے میں تازہ پھولوں کا گلہ دستہ رکھ دیا کروں
گی۔ آج پھول کم تھے اس لئے چھوٹے سرکار کے کمرہ ہی
کا گلہ دستہ سج سکا۔“

”چھوٹے سرکار کون؟“

تنویر صاحب

”وہاں گلہ دستہ رکھنے کو کس نے کہا“ پاپا گرج کر بولے، تنویر اور ساجدہ سب کچھ
سُن رہے تھے۔ ساجدہ دوڑی ہوئی گئی اور کہنے لگی۔

”پاپا میں نے ہی کہا تھا بھیا کہ کمرہ میں گلہ دستہ رکھنے کے
لئے۔ آپ کے لئے ہم تازہ پھولوں کا گلہ دستہ ابھی

منگوا دیتے ہیں“

تب ساجدہ کے پیچھے پیچھے مہر وہ بھی نیچے آگئی۔

مہر و نے دیکھا کہ چائے ویسی کی ویسی رکھی ہے۔ تب اُس نے کہا

”آپ نے چائے ابھی نہیں پی“

”تمہارا انتظار تھا مہر و“ یہ تنویر تھا

اُس پر مہر و نے نہایت حلیمی سے کہا:

”حضور نے اگر دیکھ لیا تو میں نکال دی جاؤں گی۔ جو آپ لوگوں نے میرے

لئے رزق کا دروازہ کھولا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا۔۔۔ آپ پی لیں۔ میں بھی بعد میں پی

لوں گی۔“

شام کو تنویر اور ساجدہ کار میں بازار گئے

واپسی پر تنویر نے مہر و کو ایک پاکٹ تھما دیا

”یہ تمہارے لئے مہر و“

کمرے میں جا کر اُس نے پاکٹ کھولا اُس میں ایک ریشمی شلوار و کرتے کا کپڑا

تھا۔ ایک گلابی رنگ کا ڈوپٹہ تھا۔

”رحیم چاچا کی وساطت سے ملوا دینا مہر و“ تنویر بولے

”شکریہ! پر ایسے کپڑے نوکروں کو زیب نہیں دیتے۔ کیسے پہن سکوں گی انہیں

میں“ یہ کہہ کر تنویر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ تنویر کی آنکھوں میں عاجزی تھی۔

اتنے میں ساجدہ کمرے میں آئی۔

”مہر و بہن کپڑے ٹھیک ہیں نا“

”بہن جی آپ کی پسند لا جواب ہے۔ پر آپ ذرہ کو آفتاب بنا رہی ہیں۔ کھدر پر ریشم کا تیل بوٹا لگانے سے کھدر ریشم نہیں ہو سکتا۔“ اور مہر دُڑونے لگی۔ ساجدہ نے اپنے ڈوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھے۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ مہر کو بخار ہے۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پیشانی اُس کی جل رہی تھی۔

”مہر تمہیں تو بخار ہے تم کمرے میں آرام کرو“ ساجدہ نے کہا
 ”آپ کو کھانا کھلائے بغیر میں کیسے آرام کروں“

اور وہ دوڑی ہوئی کھانا لینے چلی گئی۔ ساجدہ نے اُسے بھی کھانا کھانے کے لئے کہا۔ تب تنویر بولے
 ”اِس کے لئے دودھ اور ڈبل روٹی ٹھیک رہے گی۔“

میں ڈاکٹر آفاق سے دوائی بھی لاتا ہوں“
 یہ کہہ کر تنویر باہر چلے گئے۔ اور ساجدہ نے مہر کو زبردستی اُس کے کمرے میں لیکر آرام کرنے کی تلقین کی۔

دودھ کے ساتھ دوائی پلا کر ساجدہ اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ البتہ تنویر اپنی ادھوری کہانی ”امانت“ کو مکمل کرنے لگا۔ تنویر سوچوں کی نگری میں محو تھا کہ مہر کی کراہنے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

تنویر مہر د کے قریب گیا۔ اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ماتھا تپ رہا تھا۔ ٹمپر پیچڑ ریکارڈ کر کے دوائی دی۔ اور پھر پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تذبذب کے عالم

میں پڑا رہا اور پھر آنکھ لگ گئی۔

صبح سویرے خلاف معمول الطاف صاحب جاگے۔ اور مہرو کو آواز دی۔ رحیم چاچا مسجد گئے تھے۔ اور جواب نہ پا کر الطاف صاحب نے مہرو کے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دراز میں سے جھانک کر دیکھا تو تن من میں آگ سی لگ گئی۔ مہرو بستر پر بے سُدھ پڑی تھی اور آرام کرسی پر دراز تنویر مزے کی نیند سو رہا تھا۔ ”صاحبزادے کی یہ مجال کہ ایک نوکرانی کے کمرے میں رات بھر پڑا رہا، بے غیرت کہیں گا۔“

الطاف صاحب بڑبڑا کر اپنے کمرے میں گئے۔ رحیم چاچا نے اُن کو بتا دیا کہ مہرو کی طبیعت ٹھیک نہیں! اُسے بخار تھا۔ پر الطاف صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑا۔

اور تنویر و ساجدہ کے یونیورسٹی وکالج جانے کے بعد مہرو کو بٹاکا کے خوب ڈانٹ

پلائی۔

”آخر تمہاری وقعت ہی کیا ہے۔ ایک نوکرانی ہو اور اس

گھر کی بہو بننے کے سنے دیکھتی ہو۔ اپنی اوقات دیکھو۔

قلاش کی اولاد دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“

شام کو اُردو اکیڈمی کی غیر معمولی بیٹھک میں شرکت کرنے کے بعد تنویر واپس

آئے تو برآمدے میں رحیم چاچا کو مغموم پایا۔

”کیوں چاچا مہرو کا کیا حال ہے“

”بیٹا! وہ تو گھر چھوڑ کر چلی گئی“

تنویر کو ایسے لگا جیسے اُس کے وجود کو کسی نے کھولتے پانی میں ڈال دیا ہو۔

عالم اضطراب میں مہرو کے کمرے میں گھسا تو بہن ساجدہ وہاں مایوسی کی تصویر

بنی بیٹھی تھی۔ چہرہ اُترا ہوا۔

”ساجدہ کیا بات ہے۔ مہرو اس حالت میں کہاں چلی گئی ہوگی۔“ ساجدہ کی مری مری آواز ابھری ”بھیا کل رات آپ مہرو کے کمرے میں سو گئے تھے۔ ہمارے گھر سے نکل جانے کے بعد پاپا نے مہرو کو خوب ڈانٹا ہے۔ کتنے ظالم ہیں پاپا، میں اُن کی یہ زیادتی برداشت نہیں کر سکتی۔ آخر مہرو بے چاری کا اس میں کیا قصور تھا۔ بھیا وہ نہایت ہی شریف لڑکی ہے۔ اور بے آسرا۔ تیز بخار میں وہ نہ جانے کہاں گئی ہوگی۔ بھیا اُسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ ورنہ جانے کیا کچھ اُس کے ساتھ ہوگا۔ میری خاطر اُسے واپس لے آؤ۔“

تنویر نے بے بسی کی حالت میں کار نکالی۔ تھک ہار کر رات دیر گئے واپس خالی ہاتھ آ گیا۔ بچنا کچھ کھائے پیئے وہ سو گیا۔

ماں، ساجدہ اور رحیم چاچا نے تنویر کو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود! تنویر کی حالت ہی ابتر تھی اور چہرے پر مایوسی و اُداسی کے نقوش صاف نظر آرہے تھے۔

ادھر سے مہرو بخار کی حالت میں کوٹھی سے نکلی تھی اور بخار کی شدت سے وہ چکرا کر سڑک کنارے گر گئی۔ کچھ لوگوں نے اُسے اٹھا لیا اور پاس والے ڈاکٹر آفاق کے کلینک میں لے گئے۔ ڈاکٹر آفاق نے انجکشن دیا اور کچھ دیر بعد مہرو کو ہوش آیا۔ ڈاکٹر آفاق تنویر کے اچھے دوست تھے۔ بلکہ گریجویشن تک انہوں نے ایک ساتھ پڑھا تھا۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ تنویر کو فون کر کے بلائے لیکن مہرو نے منع کیا۔ اُس نے ڈاکٹر آفاق کو

حقیقت حال سے باخبر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کو بھی فون کر کے بلایا۔ ڈاکٹر کو تاکید کی کہ تنویر کو اصلیت نہ بتائے۔ مہر کو بہن کا درجہ بخشے ڈاکٹر آفاق نے اپنے گھر میں رکھا۔ تنویر کی طبیعت خراب چل رہی تھی۔ ڈاکٹر آفاق دیکھنے آئے تو بولے۔

”ارے یہ کیا حالت بنائی ہے اپنی“

ارے پہلے تو شادی سے انکار کرتا رہا اور اب ایک نوکرانی

کو دل دے بیٹھا۔ واہ ارے صاحبزادے کا عشق“

جواب میں الطاف نواز کی نفرت آمیز آواز گونجی۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ علاج کیجئے۔ پاپا کی باتوں پر دھیان نہ دیں۔“

یہ ساجدہ تھی۔

ملاحظہ کرنے کے بعد ڈاکٹر آفاق نے جتا دیا کہ ”تنویر کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

میں دوائی لکھ دیتا ہوں البتہ اس کی لگاتار دیکھ بھال کے لئے ایک نرس کی ضرورت ہے۔“

”آپ ہی کسی نرس کا انتظام کریں“ تنویر کی ماں بولی

”ٹھیک ہے میں کل شام نرس لیکر آؤں گا۔ اُس کے لئے الگ کمرے کا اہتمام

کرنا پڑے گا“

ڈاکٹر چلا گیا، اور پھر تنویر کی حالت بھانپنے رفیق حیات سے اُس کی ماں کہہ گئی۔

”خداے برحق نے ہمیں اتنا کچھ دے رکھا ہے اور ایک ہی بیٹا۔“

اگر تنویر مہر کو چاہتا ہے تو شادی رچانے میں کیا حرج ہے۔ بیٹی کی

خوشی کی خاطر لوگ سولی چڑھتے ہیں۔“

اس بار الطاف نواز نے خاموشی اختیار کر لی۔ تنویر کے پرشورہ چہرے نے اُس

کے غصے و عتاب کو کافور بنایا تھا۔ اگلے روز مہرو کے والدین ڈوڈہ سے تشریف لائے۔ اور دل کے ہاتھوں مجبور ہر کر مہرو نے ڈاکٹر آفاق کی وساطت ساجدہ سے ملاقات کر کے اصلیت بتادی۔ اور تاکید کی کہ قبل از وقت حقیقت کا آشکار نہ کرے۔

اگلی شام برقعہ میں ملبوس خاتون کو لیکر ڈاکٹر آفاق تنویر کو دیکھنے گئے۔

”در اصل نرس اکیلے میں تنویر سے بات کرنا چاہتی ہے۔

آپ لوگوں کو کوئی اعتراض“

سب لوگ کمرے سے نکل گئے۔ نرس نے برقع کا اگلا پٹ الٹ دیا۔ اور جا کے

تنویر کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

”مہر و تم“

”جی چھوٹے سرکار“

”لیکن پاپا اُمی کہاں گئے اتنے میں ساجدہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

”بھیا گھبراؤ مت۔ دراصل عارفین عرف مہرو پاپا کے

جگری دوست ابراہیم خولجہ کی بیٹی ہے۔ یہ پہلے رشتہ لیکر

آئے تھے اور آپ نے تب پاپا کی خواہش کا احترام نہ

کرتے ہوئے شادی سے انکار کیا تھا“۔

اسی دوران تنویر کے والدین کے ساتھ ساتھ عارفین کے والدین بھی ایک نرالی

شان کے ساتھ کمرے میں گھس گئے۔ الطاف نواز نے سب سے پہلے اپنی ہونے والی بہو کو

گلے لگایا اور نہایت ہی مُشفقانہ انداز میں زبان واکِی۔

”بیٹی مجھے معاف کرنا، میں تمہارا گناہ گار ہوں میں نے تم پر اتنے ظلم ڈھائے

کہ اب میں معافی مانگنے کے لائق بھی نہیں۔۔۔ میں

”نہیں اباجی! مجھے آپ سے کوئی گلہ یا شکوہ نہیں! میں تو خود تذبذب میں پڑی تھی کہ اصلیت کا اظہار کیسے کروں۔ یہ خدائے برحق کا کرم ہے۔ اُس نے موقع بخشا۔۔ اگر آپ مجھے نہ ڈانٹتے تو ڈاکٹر آفاق سے سامنا کیسے ہوتا۔“

”نہیں بیٹا میرا ضمیر مجھے سدا ملامت کرے گا۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں نہ جانے کیا کچھ بُرا بھلا کہا اور تم فرمانبردار بیٹی کی طرح برداشت کرتی رہی۔ میں اپنے آپ کو معاف نہ کر پاؤں گا۔“

”الطاف! اب یہ فضول کی ڈرامہ بازی ترک کر دو! دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ برات لیکر ڈاکٹر آفاق کے گھر آ جاؤ اور اپنی بہو کو سدا کے لئے نوکرانی کی خلعت بخشو۔“

اس بار ابراہیم خولجہ بات کاٹتے کہہ گئے۔ آن واحد میں کمرے میں زوردار قہقہے بلند ہو گئے۔

اور دالان میں کھڑا رحیم چاؤ در خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اُس پروردگار کا شکر گزار جس کے رحم و کرم کے صدقے یہ گھرانہ خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بنا۔ اور امانت دار کو اس کی امانت مل گئی۔

ہم سفر

ایک غیر سرکاری ادارہ کی سالانہ بیٹھک میں شرکت کرنے علی گڑھ جانا ہوا۔ خیال تھا کہ میٹنگ سے فارغ ہونے پر واپس سرینگر آ جاؤں گا۔ اچانک دہلی میں دورانِ قیام طے پایا کہ جبل پور (مدھیہ پردیش) جا کے اقربا کی صحبت میں کچھ ایام گزاروں۔

نظام الدین انجینئر سے مہاکوشل نام سے ریل گاڑی روزانہ جبل پور کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ چونکہ پیشگی ٹکٹ حاصل نہیں کی تھی اس لئے مجبوراً جنرل کمپارٹمنٹ میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ یہ تو خوش قسمتی سے ریلوے مزدور ہوشیار اور پھر تیز تھا کہ کافی بھیڑ کے باوجود اس نے میرا سامان کسی طرح بغل والی برتھ کے اوپر مخصوص جگہ پر جمادیا۔ میں نے خود دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا رہنے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔

ٹرین وقت پر چل پڑی۔۔۔ میں نے سراسیمگی کی حالت میں ڈبے کا جائزہ لیا۔ سامنے والی سیٹ (برتھ) پر کھڑکی کی جانب خوبصورت جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے بازو میں عمر رسیدہ خاتون بستر بند سے ٹیک لگائے لیٹنے کے انداز میں آنکھیں بند کر کے دراز پڑی تھی۔

”محترمہ اپنا ہولڈل ذرا سرکا دو تا کہ میں بھی بیٹھ سکوں“

میں نے نہایت ہی انکساری کے ساتھ غیر ارادی طور اپنی زبان وا کر دی۔ بدلے میں معمر خاتون نے بند آنکھیں کھول دیں اور نفرت بھری نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

”میری طبیعت خراب چل رہی ہے اس لئے لیٹی ہوں“ اس کے ساتھ ہی اس

نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے آنکھیں بند کر دیں۔ لڑکی معصوم نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے میری حالت پر رحم آیا ہو۔ بے بسی کے عالم میں ڈبے میں نصب پتکے کو دیکھنے لگا جو مرے مرے انداز میں چل رہا تھا۔ آگرہ سٹیشن چھوٹے ہی بڑھیا کو غالباً رفع حاجت کی وجہ سے اٹھنا پڑا۔ لڑکی اس کے ساتھ جانے سے قبل مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”سامان کا خیال رکھئے گا“

میں نے موقع غنیمت جان لیا۔ کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس کا بستر بند ذرا آگے سرکا کے برتھ کے کنارے بے شرموں کی طرح بیٹھ گیا۔ واپس آنے پر بڑھیا خشم آلود نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ البتہ لڑکی زیر لب مسکرا دی۔

ٹرین پوری رفتار سے چل پڑی۔ اب تو پورے کپارٹمنٹ میں زیادہ تر لوگ سو گئے تھے۔ کچھ کھڑے کھڑے ہی اونگھ رہے تھے اور کچھ برتھوں کے درمیان والی جگہ دری بچھا کر لیٹ گئے تھے۔ میں نے بیگ میں سے ”خاتون مشرق“ کا خصوصی شمارہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ متذکرہ دوشیزہ گاہے گاہے مجھے چور نظروں سے دیکھا کرتی، جیسے کچھ پوچھنا چاہتی ہو، لیکن معمر خاتون کی موجودگی میں چپ سادھے بیٹھی رہی۔

گوالیار پہنچنے پر میرے مقابل والی برتھ خالی ہو گئی۔ برقعہ پوش خاتون غالباً اپنے میاں سمیت اتر گئی۔ میں نے جھٹ بیگ سے چادر نکال کر سیٹ پر بچھا دیا اور ڈگ بیگ سرہانے میں پھونک بھرنے لگا۔۔۔۔۔ میری اس غلت پسندانہ حرکت پر لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے نقوش واضح انداز میں ابھرنے لگے۔ چند منٹوں کے بعد گاڑی چلنے لگی۔

بڑھیا خراٹے بھر رہی تھی

”کون سا رسالہ پڑھ رہے ہیں آپ“۔ دوشیزہ نے خاشاوشی کے بندھن توڑ ہی

”خاتون مشرق“۔۔۔ دہلی سے شائع ہوتا ہے۔۔۔ ”اس میں۔۔۔۔

”جی ہاں اس میں مفید مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔

خواتین کی بابت یہ ماہنامہ کارآمد مواد فراہم کرتا ہے۔“

لڑکی نے بات کاٹتے جواب دیا۔

میں نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے رسالہ اس کی جانب بڑھادیا اور خود

اپنے یار غار اور معتبر قلم کار نور شاہ کے افسانوی مجموعہ ”بے شرمچ“ کی ورق گردانی کرنے

لگا۔

”یہ تصویر آپ کی ہے نا“۔ لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”جی ہاں! کبھی کبھار گردش دوران کے پس منظر میں کاغذ

داغدار کر لیا کرتا ہوں۔“

اس خصوصی شمارے میں میری کہانی ”شیدا“ کے عنوان سے چھپی تھی۔ والدین کی

دائمی جدائی کے بعد شیدا اپنے چھوٹے بھائی راج کے ساتھ گزر بسر کر رہی تھی۔ اچانک شیدا

ایک امیر زادہ کی چکنی چڑی باتوں میں آکر اسے چاہنے لگی۔ گو امیر زادہ گوپال عمر میں شیدا

سے کافی بڑا تھا لیکن اس کے عیاشانہ اطوار، عالیشان بنگلہ، کار اور لمبی چوڑی جاسیدانے

شیدا کو پوری طور زیر کر دیا۔ وہ گوپال کو دل و جان سے چاہنے لگی یہ جانتے ہوئے بھی کہ

گوپال نے اپنی بیوی سے ناطہ توڑ دیا ہے اور ایک بچی گوپال کے پاس ہی پرورش پا رہی

ہے۔ راج نے اپنی بہن میں غیر متوقع تبدیلی بھانپنے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن شیدا

نے دھیان نہیں دیا۔ دراصل اس کے سر پر عیاشی سے زندگی گزارنے کا بھوت سوار ہوا

تھا۔ اب تو اپنے بھائی کا وجود تک اسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ راج اپنی بہن کی بے رخی بھانپ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔

”کیا ایک بہن اس قدر سنگدلی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ میرا دل یہ سب ماننے کو تیار نہیں۔“

کہانی پڑھنے کے بعد دوشیزہ نے اپنے تاثرات ظاہر کئے۔
”ویسے جب تک کہانی کا پلاٹ سامنے نہ منڈلائے میں کاغذ داغدار کر ہی نہیں سکتا۔ عموماً جو واقعات میرے رو برو وقوع پذیر ہوتے ہیں میں انہی کو ضبطِ تحریر میں لایا کرتا ہوں۔“

تو کیا یہ کہانی بھی ایک سچائی ہے؟
”جی ہاں“ میں نے بے تامل جواب دیا۔
بڑھیا برابر خرائٹیں بھر رہی تھیں۔

”آپ کو کہاں جانا ہے؟“ میں نے موضوعِ سخن بدلنے کی سعی کی۔
”ہمیں ساگر جانا ہے“ لڑکی نے سر ہلاتے جواب دیا۔
”کیا آپ دہلی میں رہتی ہے؟“ کچھ مزید جاننے کی ٹوہ میں کہہ گیا۔
”نہیں! دراصل دہلی میں میرے بڑے بھیا رہتے ہیں۔
وہاں وہ کسٹم آفیسر ہیں۔ ان کے پاس گئے تھے۔ دادی میرے ہمراہ ہے“

اب کی بار لڑکی نے اپنائیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”آپ بھی سو جائے رات کافی بیت چکی ہے“

”مجھے سفر میں نیند کم آتی ہے“

کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ وہ خاتون مشرق کی ورق گردانی میں مشغول تھی۔
دفعۃً اُس کی زبان کام کر گئی۔

”ہاں تو آپ نے اپنی بابت کچھ نہیں بتایا“

”میں ایک معمولی کہانی کار ہوں، کشمیر کارہنے والا ہوں۔

اور اس وقت جبل پور جا رہا ہوں“

”آپ کا نام بہت ہی پیارا ہے“ لڑکی نہ جانے کس جذبے کے تحت کہہ گئی۔

”بھئی میرا نام ہی پیارا ہے“

”نہیں آپ بھی تو اچھی شخصیت کے مالک جان پڑتے ہیں“

”میرا اصلی نام عندلیب اختر مرزا ہے۔ قلمی نام عندلیب

کاشمیری۔ ہاں تو آپ نے اپنا نام بتایا ہی نہیں“

میرا نام سرین ہے“ لڑکی نے جھٹ جواب دیا اور مجھے دزدیدہ نظروں سے
گھورنے لگی۔

”آپ جبل پور میں ملازمت کر رہے ہیں یا کاروبار کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔“

لڑکی نے جسم سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں! ملازمت کے سلسلے میں میرا قیام آج کل جموں میں ہے۔“

”تو آپ جبل پور کس غرض سے جا رہے ہیں“

دو شیزہ کی رگ تجس پھرک اٹھنی

”میں اپنے سسرال جا رہا ہوں“

”تو کیا آپ شادی شدہ ہیں۔“ لڑکی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

”جی ہاں! خدا کے فضل سے ایک عدد بیٹے کا باپ بھی ہوں“

اتنا سننا تھا کہ لڑکی کی حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ غصے اور نفرت کے نقوش اس کے

چہرے پر نمایاں ہونے لگے۔ اس کی معصوم و پرکشش آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا ہو۔

”تو اب تک آپ مجھے بے وقوف بنا رہے تھے“

یہ کہتے ہی نسرین نے ”خاتون مشرق“ میری جانب عجب انداز میں پھینک دیا

اور حقارت بھری نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ جیسے میں نے اُسے کسی طرح کا دھوکہ دیا

ہو۔ لڑکی کے اس غیر متوقع رویے پر تعجب ہوا۔

”دادی مجھے نیند آرہی ہے۔ اب اُٹھ کے بیٹھ جاؤ۔ کسی کا کیا بھروسہ۔۔۔۔۔“

اب تو لہجہ میں ترشی کا عنصر غالب تھا۔

دادی کے جاگنے کے بعد لڑکی برتھ پر لیٹ گئی۔ گو کچھ ٹانے قبل اس کی آنکھوں

میں نیند کے خماری کی جھلک تک نظر نہ آتی تھی۔

مجھ پر لڑکی کے اس بدلتے رویے کے باعث اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔

”خاتون مشرق“ رسالہ اور ”بے شریچ“ افسانوی مجموعہ بیگ میں رکھ کر کروٹ بدل کر میں

نے بھی سونے کی کوشش کی۔

ٹرین پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ سارے کمپارٹمنٹ میں فقط گاڑی اور پنکھوں

کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی دوران میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے

لگیں۔۔۔ ایک جگہ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔

اب تو ڈبہ کیا بلکہ سارا کپار ٹمنٹ خالی خالی لگ رہا تھا بہت سے مسافر گواہیاں سے
ساگر تک اتر گئے تھے۔ نسرین بھی دادی کے ساتھ اتر گئی تھی۔ اس کے برتھ پر ایک عمر
رسیدہ شخص بیٹھا تھا۔

میں نے سرہانے کی ہوائ نکال کے اسے بیگ میں رکھا۔
”آپ کا نام عندلیب ہے“ عمر رسیدہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا
”جی ہاں“

اس نے کاغذ کا پرزہ قمیض کی اگلی جیب سے نکالے میری جانب بڑھا دیا۔
”میری سیٹ پر بیٹھی محترمہ نے تمہارے لئے دیا ہے۔ وہ ساگر اسٹیشن پر اتر گئی“
تذبذب کی حالت میں خط کی گدازیوں میں جھانکنے لگا۔
عندلیب صاحب

آج میں جان گئی کہ کہانی کاروں کے دلوں میں محبت نام کا جذبہ ناپید ہوتا ہے۔
وہ فقط معصوم لڑکیوں سے مذاق رابطہ بڑھاتے ہیں اور جی بھرنے پر ان کو پائے حقارت سے
ٹھکرا دیتے ہیں۔ آپ نے بھی اصلیت ظاہر نہ کر کے میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش
کی۔

عندلیب صاحب دراصل لڑکیوں کو غلط ڈگر پر گامزن ہونے کی تحریک مردوں
سے ہی ملتی ہے۔ التماس ہے کہ دوسروں کی کوتاہیوں کو اجاگر کرنے کے بجائے اپنی ذاتی
علتوں و کمزوریوں کو دور کرنے کی تگ و دو کریں۔

نسرین نے اپنے دل کا غبار تو نکال دیا اور افسوس یہ کہ مجھے صفائی میں کچھ کہنے کا
موقع بھی نہ ملا۔

بھنورا

جواد صاحب کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اچھا کاروبار چل رہا تھا۔ پشمینہ، شال اور ریشمی ملبوسات کی تیاری و فروخت کے سلسلے میں ریاست سے باہر بھی قیام کرنا پڑتا۔ سردیوں میں بمبئی اور پھر مسقط میں کچھ مہینے گزارنا اُس کا معمول بنا تھا۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔

بس ایک سال کے اندر ہی جواد کے آباد گھرانے میں ویرانی نے ڈیرا بھانا شروع کر دیا۔ یکے بعد دیگرے والد صاحب، چھوٹے برادر اور اپنا اکلوتا بیٹا قاسم ہمیشہ کی نیند کیا سو گئے کہ جواد کے بلند حوصلے دم سکت پڑنے لگے۔ اتنی بڑی حویلی میں اب لے دے کے اُس کی شریک حیات کلثوم اور بیٹی صبار ہا کرتی تھیں۔ ساتھ میں صادق بابا خادم کے طور بچپن سے اس گھرانے سے وابستہ تھا۔

جواد صاحب کی کاروباری دنیا بھی سکڑ کر رہ گئی اور اب اُس کا سرمائی سفر کچھ ہفتوں پر محیط دہلی تک محدود ہو کے رہا تھا۔ جواد کو بیٹی صبا سے بے انتہا محبت تھی۔ اب بیٹی ہی اُس کی تمام تر توجہ کا مرکز تھی۔ غرض اُن کی تمام اُمیدیں اُسی سے وابستہ تھیں۔ صبا بلا کی ذہین اور روشن دماغ تھی۔

جواد صاحب نے صبا کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا تھا۔ اُس نے دُنوی تعلیم

کے اعلیٰ مقام کو حاصل کیا کر لیا کہ جواد صاحب کو جیسے مسرتوں کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ غریبوں اور مسکینوں میں نقدی و کپڑے بانٹنے کے علاوہ جان پہچان والوں کے لئے شہر کے مشہور ہوٹل ”ممتاز“ میں ضیافت کا اہتمام بھی کرایا۔

جواد صاحب چاہتے تھے کہ اگر دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ صبا کے لئے دنیوی تعلیم کا بندوبست بھی کیا جائے تو بہتر رہے گا۔ اس طرح سے وہ زندگی کے مسائل کامیابی کے ساتھ سلجھا سکے گی۔ وہ ایک قابل اور با اعتماد شخص کی تلاش میں تھے کہ اُن کی ملاقات مولانا ندیم سے ہوئی۔ وہ بچپن میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ میٹرک کرنے کے بعد مولانا صاحب مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی خاطر دیوبند (یوپی) چلے گئے تھے۔ اور آج کل سرکاری اسکول میں دینیات پڑھانے پر مامور ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مقامی روزنامہ میں کالم نویس کا کام بھی سنبھالا ہے۔ جواد صاحب کو مولانا صاحب معتبر و با اعتماد لگے اور اُن کو اپنے ساتھ گھرا لیا۔

”یہ ہیں مولانا ندیم صاحب میرے بچپن کے شناسا۔ یہ آج سے اس حویلی میں رہینگے اور صبا کو عربی اور مذہبی تعلیم سے روشناس کریں گے۔ ساتھ میں میری غیر حاضری میں صادق بابا کی شرکت میں آپ لوگوں کا خیال رکھینگے۔“

جواد صاحب نے بیگم صاحبہ اور بیٹی صبا کو اپنا دو ٹوک فیصلہ سنا دیا اور خود بغل والے دالان میں گھس آج کے اخبار کا جائزہ لینے لگے۔ مولانا ندیم دراصل کپواڑہ کے رہنے والے تھے اور یہاں مسلم اوقاف کے ایک کمرہ میں بطور کرایہ دار قیام پذیر تھے۔ گویا مولانا صاحب صبا کی دنیا میں ایک نئی شخصیت کے طور وارد ہوئے وہ بھی

ایک اتالیق بن کر۔ صبا اُن کا احترام کرنے لگی اور اُس کے لئے دل میں اتنی عزت تھی جتنی اپنے ابا کے لئے۔ لیکن فطری شوخی سے مجبور ہو کر کبھی کبھی اپنائیت میں مولانا پر کوئی فقرہ چشت کر دیتی اور مولانا خوشی کا اظہار کرتے۔ الغرض مولانا نے درس و تدریس کا یہ سلسلہ بڑی دل چسپی سے شروع کر دیا۔۔۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بیت گئے۔ مولانا صبا کے درس کے بجائے اُس کی ذات میں زیادہ دل چسپی لینے لگے۔ اب مولانا اُسے پڑھاتے کم تھے اور دیکھا زیادہ کرتے تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے اچانک مولانا کی نظریں کتاب سے اُنھ کے صبا کے چہرے پر جم جاتیں اور صبا اُن کی بُری طرح گھورنے کی تاب نہ لا کر آنکھیں نیچی کر لیتی۔ مولانا کا کچھ وقت یوں ہی بے خودی کے عالم میں گزر جاتا اور صبا تو بس سوچتی رہ جاتی۔

ایک دفعہ مولانا عربی قاعدہ ہاتھ میں لیکر باغیچے میں نکل آئے۔ صبا نے صادق بابا سے دھمکریاں باہر لگوا دیں۔ اور دونوں بیٹھ کے دھرائے گئے سبق کا ورد کرنے لگے۔۔۔ اتنے میں ایک بڑا کالا بھنورا صبا کے کان کے قریب آ کر گھوں گھوں کرتا رہا۔ صبا نے ہاتھ سے اُسے جھٹک دیا۔ اور بھنورا پاس ہی پھولوں کی کیاری میں منڈلانے لگا۔ اتنے میں مولانا ندیم نے صبا کو اندازِ دگر میں گھورتے ہوئے کہا:

”بھنورا کی شکل اور آواز کتنی نفرت انگیز ہے۔ مگر اِس کے دل میں بھی محبت کی شمع روشن ہے اور یہی اُسے سدا بے قرار رکھتی ہے۔ اور اِسی بے قراری میں بھنورا گُل کی تلاش میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہی اِس کی زندگی ہے۔“

”لیکن بھنورا تو ہر گُل پر نثار ہوتا ہے اور ہر چیز کے متلاشی

کو نا اُمید ہی ہونا پڑتا ہے۔“

نہ جانے مولانا کس سوچ میں غرق تھے کہ صبا کے جواب سے لا جواب سے ہو گئے۔

چند روز بعد صبا نے اوپری گیلری سے ایک ناوارد کو کوٹھی کے پھانک میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ خود اندر چلی گئی۔ صادق بابا کو دریافت کرنے کے لئے بھیجا۔ لیکن وہ شخص بے دریغ زنانہ کی طرف آ رہا تھا۔ صبا اس جرأت پر غصہ سے بے تاب ہو گئی۔ لیکن ناوارد کی شکل و صورت دیکھ کر وہ ٹھنک کر رہ گئی۔

یہ تو مولانا تھے لیکن داڑھی مونچھ غائب تھی۔

صبا مولانا کی یہ حالت بھانپنے بے اختیار ہنس پڑی اور جھٹ اُمی کو آواز دی۔
بیگم جواد نے آ کر اس حلیہ کی تبدیلی کی وجہ دریافت کی تو مولانا نے اپنے لال پیلے دانت نکال دئے اور مسکرانے کی کوشش کرتے فرمایا

”بس یونہی! دراصل بات یہ تھی کہ خضاب وغیرہ کے

استعمال سے داڑھی میں کہیں کوئی سفید بال رہ جاتا ہے

اور یہ عمر کے راز کو فاش کر دیتا۔“

گویا اس ڈھلتی عمر میں ندیم کی خوبصورت نظر آنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ ویسے ناک بڑی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے اور رنگ بھی نیم گندمی! اس کے بعد بھی ندیم کو اپنی شکل کے متعلق اب بھی بڑی غلط فہمی تھی۔ داڑھی کی وجہ سے اُن کے چہرے سے کچھ عظمت و بزرگی ٹپکتی تھی اب وہ بھی جاتی رہی۔ رہی سہی صورت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور اُس کے ساتھ ”مولانا“ کا معزز سامنام بھی مختصر ہو گیا۔ وہ اب صرف ندیم بن کر رہ گئے۔

جواد صاحب کچھ ماہ بعد گھر واپس لوٹے۔ یہ خبر سُن کر ندیم بہت خوش ہوئے۔ وہ اپنے اصل کو اور حقیقت کو بھول چکے تھے اور آج وہ اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ نہ معلوم کیوں اُن کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ صبا بھی اُن کی ہم خیال ہے۔ ندیم نے آج خوبصورت نظر آنے کی کوشش میں کریم وغیرہ کا آزادانہ استعمال کیا تھا۔ چہرے کی ٹھہریاں کچھ ماند پڑ گئی تھیں۔ شیونیا بنوایا تھا۔ نئی شیروانی پہنیں خوشبو وغیرہ لگا کر جواد صاحب کے حضور میں حاضری دی۔

جواد صاحب کو اُن کے ندیم بننے کی خبر مل چکی تھی اس لئے انہیں دیکھ کر کوئی خاص حیرانی نہ ہوئی۔

کاروباری معاملات سے بات گھریلو حالات کی جانب چلی تو ندیم نے فرمایا

”صبا اب جوان ہو گئی ہے آپ نے اُس کے متعلق کچھ سوچا“

”میں تو مصروف رہا۔ تم گھر پر رہتے ہو، کچھ کوشش کی

ہوتی اور پھر تمہارے علاوہ اس کام کو کرے گا کون؟“

جواد صاحب کی باتوں سے ندیم دلیر ہو گئے اور قدرے اطمینان سے فرمایا

”یہ تو میں نے پہلے ہی جان لیا تھا اور اس لئے اس کا انتظام بھی کر لیا ہے“

”سچ“

”ہاں سچ“

”تو کون سا گھر دیکھا ہے آپ نے؟“

”بندہ حاضر ہے اور صبا کو دل و جان سے چاہتا ہے“

اور شاید صبا۔۔۔۔۔

ندیم صاحب اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے سر کے سفید بالوں کی جڑوں کو مچھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواد صاحب کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ جواد صاحب کا چہرہ غمیض و غضب سے بھرا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ رد عمل میں کچھ کہہ دیتا۔ اُس نے خونخوار نظروں سے ندیم کو گھورا۔ اور اس کے ساتھ ہی بیگم جواد ایک برقع پوش خاتون کے ہمراہ گوشہ راست سے برآمد ہوئی۔

”سُنتے ہو جی! یہ اس مرد و مولانا کی شریک حیات ٹھہری، اس کی دو بچیاں بھی ہیں اور دو مہینے سے اس نے رقم بھی خرچہ کے لئے ان کو نہیں بھیجی ہے۔ گھوسٹ کہیں کا، سینگ کٹا کر پھڑوں میں داخل ہونے کے خواب دیکھتا ہے۔“

یہ سُنتا تھا کہ ندیم ندامت و شرمندگی کا بحسمہ بنے جواد صاحب کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

”جواد بھائی مجھے معاف کر دو، میں واقعی کمینہ ہوں کہ اپنی اوقات فراموش کئے چاند کو مچھونے کی تمنا کی تھی۔ میں بہک گیا تھا مجھے معاف کیجئے۔“

اس کے ساتھ ہی شریک زندگی کا ہاتھ پکڑ کر حویلی سے ایسے چلا گیا کہ جیسے کسی طرح کا رابطہ یا واسطہ ہی نہ رہا ہو۔



جان سے پیاری راشدہ

آج میں اپنی بے نام اور اُجاڑ زندگی سے بہت دُور جا رہا ہوں۔ ایسی جگہ جہاں کوئی آشنا میرے تعارف کا سبب نہ بن سکے۔۔۔ ایسی جگہ جہاں اجنبیت کے سائے چار سو پھیلے ہوئے ہوں۔ شاید اسی طرح میرے ضمیر کا قتل بوجھ کسی قدر ہلکا ہو سکے۔

منشیات جن کا میں عادی رہا۔۔۔ اسی منشیات نے نہ صرف یہ کہ مجھے تباہ و برباد کر دیا بلکہ میرے سارے خاندان کو بھی مایوسی و بدنامی کے غار میں دھکیل دیا۔ واقعی اس اصلیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک شخص کی غلطی کی وجہ سے سارے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

تمہارا قصور فقط اتنا تھا راشدہ کہ بدزبانی و بدکلامی کے شیوہ کو تم نے شروع سے ہی اپنا رکھا تھا۔ تمہاری زندگی تباہ ہونے میں یقیناً اس بدزبانی کا بھی اہم کردار رہا ہے۔۔۔ طلاق کی وجہ صرف میرا وطیرہ نہیں بلکہ تمہاری کج روی بھی تھی۔

تم نے بدزبانی اپنائی اور میں نے بددماغی کی راہ پر گامزن رہ کر طلاق دی۔ اب احساس ہو رہا ہے کہ دینی تعلیم کی کمی ہونے کی وجہ سے میں طلاق کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ اور جب جانا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ تیرا مکان سے نکل چکا ہے۔۔۔۔۔ بخدا مجھے احساس نہیں تھا

کہ طلاق تلوار سے بھی زیادہ تیز دھار بن کر ازدواجی زیست کو کاٹ کے رکھے گا۔

یقین کر لو راشدہ کھنڈر نما مکان میں نگلی فرش پر لیٹا ہوں کوئی پُرساں حال نہیں۔۔۔
ماضی کی سنہری یادیں میرے غم زدہ جسم پر ریگ رہی ہیں۔۔۔ یاد کرو اپنے دوست ندیم کی
شادی میں تمہیں دیکھا تھا۔ اُسی وقت تمہیں رفیق حیات بنانے کا من ہی من میں فیصلہ
کر لیا۔ میری شادی کی بابت والدین پریشان تھے۔ وہ میرے لا اُبالی پن کی وجہ سے کوئی
رائے قائم نہیں کر پاتے تھے۔

میں نے بہن رضیہ اور ماں سے بات کی۔۔۔ وہ دونوں ندیم کے گھر گئیں تم وہاں
موجود تھیں۔ انہیں بھی تم پسند آئیں۔

گھر کے بزرگوں میں بات طے ہوئی اور ہم ازدواجی رشتے کی اہم منزل کو
چھونے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔ تقریباً تین برس ہماری ازدواجی زیست محبت کی خوشگوار
جھونکوں سے شاداب ہوتی رہی۔ پھر نہ جانے ہماری بشارت کو کس کی نظر لگ گئی کہ خوشگوار
زندگی خزاں کے زرد پتوں کی طرح مُرجھانے لگی۔

خلاف توقع گھر میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنگامہ آرائی ہوتی تھی۔۔۔ اس
نحوست کے سبب ہمارے گھر کا سکون جاتا رہا۔ میں اندر ہی اندر گھٹتا رہا۔ سب کے
ہوتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا محسوس کرتا۔ تم مجھ سے شکایت کرتی۔ گھر والے بھی مجھ سے
شکایت کرتے میں کس کی سُنا۔ میں ذہنی تناؤ کے حصار میں مقید رہا۔ سوچنے سمجھنے کی
صلاحیت جواب دینے لگی۔

منشیات کا استعمال تمہیں پا کر میں نے ترک کیا تھا۔ اب پھر عادی بنا پڑا، میرے
دوستوں کا کہنا تھا کہ اگر میں منشیات کا استعمال کرتا رہوں گا تو مجھے گھر کی تمام پریشانیوں

سے نجات مل جائے گی۔۔ دھیرے دھیرے یہ زہر جسم میں اُترتا رہا۔ اور یہ راز فاش ہوتے ہی گھر کی پریشانیوں اور ہنگاموں میں خاصہ اضافہ ہوا۔۔ گھر والوں نے مجھے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ سارے وعدے توڑ کر اس زہر کو اپنے کمزور جسم کے اندر اُتارنے پر مجبور ہوتا تھا۔

الغرض منشیات کی لت نے مجھے پورے طور یکما بنا کر رکھ دیا۔

گھر کے غیر متوازن ماحول کے باعث میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی کہ رشتہ انسان پر بوجھ بن جائے اُسے توڑنا ہی اچھا ہے۔ یہ خیال دل میں آتے ہی میں نے سب کے سامنے اور موجودگی میں طلاق کا لفظ تین بار دہرایا۔

۔۔۔ میری اس حرکت سے زبردست کھرام مچ گیا۔ خلاف اُمید میرے والدین مجھ پر برس پڑے جیسے تم اُن کی سگی اولاد ہو۔ میرا خیال تھا طلاق دینے سے والدین و بہن خوش ہونگے کیونکہ وہ سب تمہاری سخت کلامی سے بیزار تھے۔۔۔ لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ تم جیسی بھی تھی میرے والدین اس بات پر ہرگز تیار نہ تھے کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا کر دوں۔

میرے والدین کی زبردست خفگی اور ضمیر کی بیداری نے ندامت کا احساس دلایا۔

تیر ترکش سے نکلا تھا۔ میں کفِ افسوس مل کے رہ گیا۔ دراصل اپنا غصہ تمہارے اوپر اُتارنے کی غرض سے مجھے اس قدر کرخت قدم نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔ افسردہ دلی کے ساتھ اُبانے تمہیں والدین کے گھر پہنچایا۔

۔۔۔ اب منشیات کا ہی سہارا ہے

اپنی غلطیوں کے اعتراف کے طور میں یہ نگری اور شہر چھوڑ کے اس دیرانے میں آیا ہوں۔۔۔ اجنبی شہر جہاں کی ہر ہستی اور چیز میرے لئے اجنبی ہے۔

واقعی کبھی کبھی انسان کی معمولی سی غلطی یا ادنیٰ بھول سے صدیوں کے رشتے لحوں میں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔

خدا کرے تمہارے سارے غم خوشیوں اور شادمانیوں میں بدل جائیں۔

تمہاری زندگی میں ایک بار پھر بہار آجائے۔

یہ میری دعا ہے۔ خدا حافظ

میں ہوں تمہارا گناہ گار

تابش



تُرش رُو

زینت عجب جھگڑا لقمہ کی عورت تھی۔ ساری بستی میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جو اُس کی لڑائی جھگڑے سے بچا ہو۔۔۔ ذرا سی بات اُس کے مزاج کے خلاف ہوئی تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔

یوں تو بستی کی اکثر خواتین زینت کی خُرش روی سے نالاں تھیں لیکن اُس کی دھونس و بدکلامی کی وجہ سے ظاہر اُس کی عزت بھی کرتی تھیں۔۔۔ زینت کے دو جوان بیٹے تھے۔ وہ جب کسی سے مصروف جنگ ہوتی تو اپنے دونوں بیٹوں کا حوالہ دینا نہ بھولتی۔ گھمنڈ کے ساتھ کہتی۔

”میرے بھی اللہ رکھے دو بیٹے ہیں۔ شیروں جیسے،

میرے بدخواہوں اور تیرے پیاروں و عزیزوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے کافی ہیں۔“

اس کے بعد زینت حسب عادت اپنے مد مقابل کو ایسی ایسی ننگی گالیاں دیتی کہ سننے والے کانوں میں انگلیاں ٹھونکتے۔ زینت کا خاوند جمال ایک دُبھلا پتلا سا انسان تھا۔ جب تک حالات بہتر تھے اور بیٹے کم سن تھے وہ زینت کے ساتھ جوں توں کر کے گدارا کرتا رہا۔ بستی کے کُڑ پر مسجد کے پاس جمال کی کریانے کی دکان تھی۔

زینت نے اپنی کج روی اور گندی طبیعت کے باعث اُس کی زندگی بھی آجیرن کر رکھی تھی۔ جمال اُس کی روزِ روز کی بگ بگ سُن کر خاموش رہتا۔ بیوی کی کرخت مزاجی کا وہ خوگر بن چکا تھا۔ اُس کی ٹُرش و تلخ باتیں سُننے کا عادی۔۔۔۔۔ جمال نے اپنی تمام اُمیدیں لڑکوں سے وابستہ کر دی تھیں۔

وقت گذرتا گیا۔ کئی بہاریں آئیں اور خزاں زدہ ماحول میں تحلیل ہو گئیں۔ جمال کو اس احساس نے بُری طرح غم زدہ بنا لیا کہ دونوں لڑکوں پر بھی ماں کا اثر غالب ہے۔

زینت کی بد خصلتی سے لبریز طبیعت روز بہ روز عروج کو پہنچ رہی تھی۔ جمال نے بچوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن جوانی کی دہلیز پار کرنے والے دونوں لڑکوں کے ذہن بھی ماں کی صحبت میں رہ کر پلید ہو چکے تھے۔

جمال نے اکثر بار زینت کو بھلے بُرے کی بابت جانکاری دینی چاہی اور التجا کی کہ ”بچوں کو کم از کم صلح و آشتی کے ساتھ زندگی گزارنے دیں۔ ہمسایوں کے ساتھ خُسن و سلوک سے پیش آئیں۔ جب دِن پورے کر کے ہم اِس دنیا سے چلے جائیں گے تو اِن بچوں کا واسطہ ان ہی لوگوں سے پڑے گا۔ جن کو تم نے اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ کیوں بچوں کا مستقبل تباہ کرنے پر تکی ہو۔“

زینت پر ان پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوتا اور کرخت لہجے میں کہتی ”تم اپنا کام کرو بُزدل کہیں کے! میں اپنے بچوں کی دشمن نہیں ہوں اور اُن کو تمہاری طرح ڈرپوک نہیں دیکھنا

چاہتی۔۔۔ ہم کسی سے دب کر کیوں رہیں۔“

خیر روز روز کے جھگڑوں اور خاص کر بیوی کی بد مزاجی کے باعث جمال کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑا۔۔۔ بیوی اور بچوں کی ناروا حرکتوں کے سبب بستی کا چودھری لال دین بھی جمال سے کافی حد تک بدظن سا ہوا تھا۔۔۔ جمال بھی اس غیر متوازن ماحول کے زیر اثر کافی پریشان رہتا تھا۔ دکان پر اس اُس طرح کی باتیں سن کر وہ اپنے آپ کو کوستا۔۔۔ وہ اب کمزور ہو چکا تھا اور زیادہ تر گھر کے احاطے میں اخروٹ کے درخت کے نیچے پرانی کھاٹ پر لیٹے کھانتا رہتا۔ زینت اور بچوں نے اُس کی گرتی صحت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ دی۔

دراصل جمال زینت کے رنگ میں نہ رنگ سکا۔ اس کا زینت کو بڑا دکھ تھا۔ اور پھر وہ خود سری کے گھوڑے پر سوار جمال کو یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ وہ کسی کام کا نہیں۔۔۔ وہ سمجھتی تھی کہ جمال سے کھینچے کھینچے رہنے سے اُس کے ٹوکنے اور ڈانٹنے کی قوت بحال ہوگی۔۔۔ لیکن زینت یہ اصلیت نہ سمجھ پائی کہ جمال حقیقی طور بیمار تھا۔ اور شرافت کا دلدادہ! خیر بیوی اور بچوں کی بے توجہی سے اُس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ کچھ دن وہ بے بسی کے عالم میں چار پائی پر پڑا کراہتا رہا لیکن کسی ایک نے اُس کی خبر نہ لی۔

چودھری لال دین کو جمال کی ایتر حالت کا علم ہوا تو بھاگا بھاگا آیا۔ جمال کی پرشمرہ حالت دیکھ کر اُسے افسوس ہوا اور بولا

”اُف! اتنا تیز بخار، اس حالت میں تمہیں گھر کے اندر

ہونا چاہئے تھا۔۔۔ لعنت ہے ایسی بیوی واولاد پر۔۔۔

بچوں کو اتنا بھی احساس نہیں کہ تم اُن کے باپ ہو۔ چلو

میرے گھر چلو۔“

”رہنے دو چودھری! اب میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔“

میرے بیٹوں کا ذکر نہ کرو، کلیجہ چھلنی ہو چکا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے جمال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ بڑبڑانے کے بعد جمال نے چودھری کی گود میں زندگی کی آخری سانس لی۔۔۔۔

خاوند کی موت کو ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ زینت نے مغلوب الغضب فطرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہمسایہ اکبری بکری کی بیوی نادرہ کو معمولی سی بات پر بے تحاشا پیٹ ڈالا۔ اُس کے کان کا ٹھمکا اتنی زور سے کھینچا کہ وہ گوشت سمیت اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ اکبری بکری رسا توڑ کے سر کندوں کے عقب میں دھوپ میں سوکھنے والے کپڑوں میں سے زینت کی قمیض پر منہ مار گئی تھی۔۔۔ صرف قمیض کے دامن کا کچھ حصہ پھٹ گیا تھا۔۔۔ عادت سے مجبور زینت آپے سے باہر ہو گئی۔۔۔ نادرہ نے بکری کی غلطی مانتے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ معافی مانگ لی لیکن زینت کے سر پر تو جیسے بھوت سوار تھا۔ وہ اکبر اور نادرہ چھوڑ بستی والوں کے خلاف بھی بکتی رہی۔

بستی کے پیر و جواں سب کے سب چودھری لال دین کے گھر جمع ہو گئے۔ چودھری نے کچھ لوگوں کی خواہش کے بموجب معاملہ پولیس کے ہاتھوں سونپ دینے کے بجائے زینت اور اُس کے بیٹوں کا حقہ پانی بند کر دیا۔ ساری بستی میں اعلان کرایا گیا کہ کوئی زینت یا اُس کے بیٹوں سے کسی قسم کا رابطہ نہیں رکھے گا۔ غرض مرحوم جمال کے گھرانے کو برادری سے الگ کیا گیا۔ چودھری کا خیال تھا کہ اس فیصلہ سے زینت کی شہد مزاجی میں فرق پڑے گا۔۔۔۔ لیکن خلاف توقع زینت نے خوشی خوشی اس فیصلے کا خیر مقدم

کیا اور رات گئے تک مچان پر کھڑی چودھری اور اکبر کی سات پشتوں کو گالیاں بکتی رہی۔
 ہفتہ بھر تو زینت اور اُس کے بیٹوں کو بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ بستی کا کوئی
 دکاندار انہیں سودا نہ دیتا تھا۔ وہ کسی سے بات نہ کر پاتے۔ لحظہ بہ لحظہ وہ اس تنہائی کے عادی
 بن گئے۔ کھیتوں میں کام کرتے اور غور و نوش کا سامان قریب کے گاؤں سے خرید لاتے۔
 زینت اب سارا دن گھر پر رہتی۔ اب اُس میں تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ اپنا غصہ
 بچوں پر اتارنے لگی۔ ذرا برابر بھی قصور سرزد ہوتا تو جل بن کر گالیاں دینے لگتی۔
 ایک روز بڑے لڑکے تاج کے ہاتھ سے چینی کا پیالہ گر کر ٹوٹ گیا زینت برس
 پڑی۔

”حرام زادے تیرے ہاتھوں کو لقمہ ہوا ہے کیا۔ یہ پیالہ کیوں توڑا؟“
 میرے ہاتھ چکنے تھے ماں اس لئے سنبھال نہ سکا۔“
 اس پر ماں بولی ”تیرے ہاتھوں کو قلم کیوں نہ کر دوں۔ تیرا باپ زندہ ہے جو شہر
 سے نیا پیالہ لائے گا۔“
 ماں کی تلخ روی پر دونوں بھائی کہتے میں آگئے اور وہ سوچنے لگے کہ ماں کا دماغ
 خراب ہو گیا ہے۔

دوسرے روز جب دونوں بھائی صحن میں بیٹھے گئے چوس رہے تھے ڈاکیہ نے
 حیلوار کے اندر لفافہ پھینکا۔

تاج نے لفافہ اٹھایا اور اپنے ماموں فضل دین کی تحریر پہچانی۔
 تاج اور مبارک کی منگنی ماموں کی دونوں لڑکیوں سے طے پائی تھی۔
 خط چاک کرنے پر یہ اصلیت واضح ہو گئی کہ برادری سے الگ کرنے کے فیصلے کو

جانتے ہی ماموں نے منگنیاں منسوخ کر دی تھیں۔

تاج اور مبارک کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ دونوں حسرت و یاس کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔

زینت کو جب اپنے بھائی کے اس فیصلے کا علم ہوا تو اُس نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کیا۔

”مکنا، مکینہ، میرے لڑکوں کو اپنی لڑکیاں دینے سے منکر گیا! لگتا

ہے کہ اُس کی رگوں میں میرے باپ کا خون ہی نہیں ہے۔“

تاج آٹھویں جماعت تک پڑھا ہوا تھا۔ اور کچھ سمجھ دار تھا۔ وہ جان گیا کہ ماموں جان نے کن حالات میں منگنیاں توڑ دیں تھیں۔ ماں کی فسادِ عادات کے باعث یہ سب کچھ ہوا ہے۔

تمام حالات کا جائزہ لیتے ہوئے تاج اور مبارک نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دونوں تھوڑا بہت سامان اٹھا کر پاس والی پہاڑی بستی میں سکونت کریں گے۔ انہیں اپنی ماں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اب اُس سے الگ رہنا چاہتے تھے۔

ایک دن دوپہر کے وقت جب وہ اپنا سامان اٹھانے لگے تو زینت نے خشم آلود نگاہوں سے انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سب کیا ہے تم یہ برتن کپڑے وغیرہ کیوں اکٹھا کر رہے ہو؟“

”ہم اب یہاں نہیں رہیں گے“ تاج نے جواب دیا۔

”کیوں؟ یہاں کوئی ڈاؤن رہتی ہے کیا جو تمہیں کھائے گی؟“

”تم کسی ڈاؤن سے کم تو نہیں ہو“ مبارک نے غصہ سے کہا

یہ سُن کر زینت کی چیخ نکل گئی۔

”کینے! تم نے اپنی ماں کو ڈائن کہا۔ خدا کرے تو

مر جائے۔۔۔ تیرے جسم میں کیڑے پڑ جائیں۔ سانپ

تم دونوں کو ڈس جائے“

یہ کہ کر سر پینٹنا شروع کر دیا۔۔۔ اُس کی چیخ پکار سنکر آس پاس کے لوگ اپنے

مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو گئے۔

تاج اور مبارک نے تھوڑا بہت سامان باندھا اور کمرے سے باہر آ گئے۔ زینت

یکدم جوش کے ساتھ اٹھی اور سامان کی گھڑی تاج سے چھین لی۔

”حرام زادے۔۔۔ سو رکی اولاد۔ تم لوگ یہاں سے کچھ نہیں لے جا سکتے۔“

”دور ہٹ“ تاج نے ماں کو دھکا دے کر گھڑی اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔

زینت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاس ہی پڑی پتھر کی ریل اٹھا کر تاج کے ہاتھوں پر دے

ماری۔ تاج شدتِ درد سے چلا اٹھا۔

زینت کا ریل والا ہاتھ پھر ہوا میں بلند ہوا۔

مبارک نے جھپٹ کر ماں سے ریل چھین لی اور سر اسمبلی کی حالت میں اُس

کے سر پر دے ماری۔

دیکھتے ہی دیکھتے زینت کے سر سے خون کا فوراً جھوٹا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

آس پاس کے لوگوں نے دیکھا کہ خون میں لت پت زینت کی لاش صحن میں

ٹوٹی کھاٹ پر پڑی ہے۔ مبارک کو پولیس نے حراست میں لیا اور تاج بے بسی کے عالم

میں اپنی بد قسمتی پر رورہا ہے۔

ماں بننے کا خواب

پہلے پہل سننے میں آیا کہ ہینڈ آفس میں میناکشی کو تعینات کرنا بڑے بابو موہن کمار کو قطعاً اچھا نہیں لگا۔ میناکشی کی بابت احباب کی زبانی سُن رکھا تھا کہ وہ آزاد پنچھی کی طرح زندگی گزارنے کی دلدادہ ہے اور غیر مناسب سلوک و ناروا عادات کے باعث اُس نے چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں اپنے پتی سے ٹھٹھکا را حاصل کر لیا تھا۔

ویسے میناکشی کے پتی راجندر سنگھ کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کے ساتھ ساتھ محکمہ مال میں ایک اچھے اور اہم عہدے پر فائز تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی شریک حیات چراغ خانہ کے بجائے شمع محفل بن جائے۔ اپنی اس چاہت کو طشت از بلیم کرنے پر بے بسائے خوشحال گھرانے کی وسعتوں میں افراتفری و کدورت کے بادل منڈلانے لگے۔ کالج کی کھلی فضا میں نام کمانے والی میناکشی نے شارت ہینڈ کے ساتھ ساتھ کمپوٹر ٹینگ بھی مکمل کر لی تھی۔ محکمہ برقیات میں پرسنل اسٹنٹ کی جگہ حاصل کرنے میں اُسے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔

اپنے بزرگوں خاص کر ماما پتا کی خواہش کے خلاف میناکشی نے راجندر سنگھ کی

زندگی میں زہر گھولنا شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاک و پوتر رشتہ کچے دھاگے کی صورت ٹوٹ کے رہ گیا۔ اور میناکشی پھر سے آزاد پرندے کی طرح وسیع و عریض فضا میں اڑنے لگی۔۔۔ میناکشی کی اس غیر متوقع حرکت کے باعث ماتا پتیا پر جیسے بجلی گر گئی وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ بچپن سے جو بے جا آزادی اپنی پہلی اولاد کو دے رکھی تھی اُس کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ پھر بھی جی کڑا کر کے ماں نے کرخت لہجہ اپنائے کہہ دیا کہ اُس کی اس ناروا حرکت سے چھوٹی بہن کی زندگی بُرا د ہو کے رہ جائے گی۔ راجندر سنگھ سے ناٹھ توڑنے کے بعد میناکشی کو جان پہچان والوں اور رشتہ داروں سے بھی اس اُس طرح کی باتیں سننی پڑیں۔ ان طعنوں کی تاب نہ لا کے اُس نے ایک آشنا کی وساطت اپنا تبادلہ ہیڈ آفس میں کرایا جس کے اراکین گرمیوں کے ایام سرینگر اور سردیوں کے ایام جموں میں گزارتے تھے۔ اب وہ قدرے مطمئن تھی کہ کم از کم سال میں چھ ماہ جلی کئی باتیں سننے کو نہ ملیں گی۔

ویسے میناکشی زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ البتہ بے پناہ بناؤ سنگار کے باعث وہ انیس بیس برس کی دوشیزہ لگتی تھی۔ نئے ماڈل کے فیشن ایبل لباس پہننے کو ترجیح دیتی تھی جو مختصر و مبہین ہوتا کہ جسم کے نشیب و فراز کی واضح انداز میں نمائش ہو سکے۔

قبول صورت

بھرا بھرا جسم

مختصر قد۔۔۔۔ غزالہ آنکھیں

اُبھری ہوئی پیشانی

کالے کالے لمبے گیسوار

چہرے کے دائیں جانب آنکھ کے نیچے گیند کے موافق ایک سیاہ تل، بات کرنے اور چلنے کے انداز میں غضب کا توازن۔

میناکشی کو موہن کمار کے کشادہ کمرے میں بازو والی کھڑکی کے پاس بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔۔۔ بڑے صاحب کے اس فیصلے پر موہن کمار نے زبردست احتجاج کیا تھا۔ لیکن پھر میناکشی کے توبہ شکن لہجہ کے آگے اُس نے لحظہ بہ لحظہ ہتھیار ڈالنے شروع کر دیے۔ اب اس بابت واویلا کرنے کے بجائے وہ گاہے گاہے چور نظروں سے میناکشی کے سراپا کا جائزہ لینے لگتے۔ جدید طرز کے رنگ برنگے اور معطر کپڑوں میں ملبوس میناکشی کمرے میں گھس جاتی تو اس پاس مدہوش کُن خوشبو پھیل جاتی۔ ویسے موہن کمار جلتا حُسن پرست تھا۔ ہر خوبصورت شے اُسے اچھی لگتی تھی۔ خوبصورت پتھروں یا کانٹوں سے بھی وہ والہانہ پیار کرتا تھا۔ میناکشی تو ایک جیتی جاگتی حُسن کی مورتی تھی۔ مہین سا پُخت سوٹ یا ریشمی ساڑھی پہن کے دفتر آنا اُس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ برائے نام بلوز یا کھلے گلے کا کرتا پہن لیتی تاکہ سینے کے اُبھار واضح طور نمایاں ہوں۔ غرض بے حیائی سے لبریز ہتھکنڈے اپنائے اُس نے چند ہفتوں میں موہن کمار کو اپنی طرف مائل کر دیا۔۔۔ اب تو بسا اوقات میناکشی کے خدو خال کا جائزہ لینے کی خاطر موہن کمار نظروں کی پیاس بجھایا کرتے تھے۔

موہن کمار تین بچوں کے باپ تھے۔ اُن کی شریک حیات بھی قبول صورت و شاداب صحت کی مالک تھی۔ وہ سرکاری اسکول میں ٹیچر تھی اور بچے بھی جموں میں ہی زیر تعلیم تھے۔ دفاتر سرینگر منتقل ہونے پر وہ بچوں کے ساتھ جموں میں ہی قیام کرتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں پڑنے پر ساری فیملی سرینگر آ جاتی۔ موہن کمار سرکاری کوارٹر میں زیادہ تر اکیلے ہی قیام کرتے تھے۔ گھریلو کام کرنے کے لئے چہر اسی کالوننگھ کو چھوٹا کر دے رکھا تھا۔

لحظہ بہ لحظہ میناکشی اور موہن کمار کے آپسی بڑھتے تعلقات کی بُو باس بند کمرے سے نکل کر دفتر کی وسعتوں میں پھیلنے لگی۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر طرح طرح کی باتیں آنے لگیں۔ میناکشی اپنی دو سہیلیوں کے ہمراہ پاس میں ہی سرکاری فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت موہن کمار کی صحبت میں ہی گزارنے لگی۔ اور صبح و شام کوارٹر میں جا کے کالوسنگھ کا ہاتھ بھی بٹانے لگی۔ الغرض میناکشی نے اپنی دل فریب اداؤں سے موہن کمار کو پوری طرح زیر کر لیا۔ اب تو ہر وقت اُس کے احساسات اور جذبات پر میناکشی سوار رہنے لگی۔ موقع ملتے ہی ٹیلی فون کرنے یا ڈکٹیشن لینے کے بہانے میناکشی بسا اوقات موہن کمار کی کرسی کے بازو پر یوں سوار ہو جاتی کہ دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس ہو جاتے۔

ایک روز میناکشی دفتر نہیں آئی۔ موہن کمار پریشانی کے عالم میں غرق بے چین ہوا ٹھہرے۔ اصلیت جاننے کی ٹوہ میں ماتحت عملہ سے پوچھتا چھہ کر دی لیکن خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ وہ بار بار میناکشی کی کرسی کو گھورتا جو خالی پڑی تھی۔ اتنے میں کالوسنگھ نے میناکشی کی درخواست سامنے بڑھادی اور کہا:

”بابو جی آپ کے چلے جانے کے بعد میناجی آگئی تھی کہتی تھی طبیعت ٹھیک نہیں اور اپنے کوارٹر میں ہی آرام کر رہی ہے۔“

موہن کمار کو ایک ایک پل سال کے برابر لگنے لگا۔ اور پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے بڑے صاحب سے اجازت لیکر سرکاری گاڑی میں کوارٹر کی جانب چل پڑا۔ کالوسنگھ کو اُس کی دیرینہ چاہت کے تحت شکر اچار یہ مندر جانے کی اجازت دیدی۔

مینا کشی نیم عریاں لباس میں ملبوس آرام کرسی پر براجمان ”سرتتا“ کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پہ شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں خاص طرح کا خمار۔۔۔ موہن کمار کے دل میں طوفان پیا ہوا اور انگ انگ میں مستی بھری طراوت دوڑنے لگی۔ صدر دروازہ بند کئے الماری میں سے بوتل اور تلے ہوئے شامی کباب کی پلیٹ نکال کے سبہ پائی پر رکھ دی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ایک دوسرے کو اندازِ دگر میں گھورنے لگے۔ بوتل کا گگ اڑ گیا اور سامنے پڑے جام بھرنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں مینا کشی مستی کے عالم میں جھومنے لگی۔ سینے کے اُبھار کو نمایاں کرنے کی نیت سے آنچل ہٹا دیا۔۔۔ دونوں کچھ دیر ایک عجب کشمکش میں مبتلا ہوئے۔۔۔ رفتہ رفتہ احساسِ گناہ دماغ سے جاتا رہا اور ایک شباب و مستی بھر انغمہ نس نس میں گونجنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی مختصر دنیا بدحواسی میں جھومنے لگی۔ اور ہوس پرستی کے قہقہے فضا میں بلند ہونے لگے۔۔۔ اسی عالم میں موہن کمار نے مینا کشی کو باہوں میں لیکر کمرہ شب باشی کا رخ کیا۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کے بعد شریانون میں خون کے بجائے دھکتے شعلے دوڑنے لگے۔

اب یہ معمول بن گیا کہ وقت ملنے پر موہن کمار اور مینا کشی ایک دوسرے کی ہوس کی پیاس بجھانے لگے۔

سردیاں شروع ہوتے ہی دربار کے ساتھ دفاتر جموں منتقل ہو گئے اب تو گھر میں قیام کرنے کے سبب موہن کمار آزادانہ طور مینا کشی سے نہ مل پائے۔ البتہ مینا کشی کی چاہت کے تحت اُسے اپنے یارِ غار چندر پرکاش کی کوٹھی میں ایک کمرہ درسوئی مہیا کرادی جس کا کرایہ موہن کمار ادا کرنے لگے۔ اس طرح موقع ملتے ہی وہ کچھ وقت مینا کشی کی

صحبت میں گزارنے لگے۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ اپنی سہیلیوں کی خوشگوار ازدواجی زندگی کو بھانپنے میناکشی کا دل بھی چاہنے لگا کہ کسی ایک کو اپنا ساتھی چن لے۔ اُس کا بھی گھربار اور بال بچے ہوں۔۔۔۔۔ روز روز کے ہوس پرستانہ کھیل سے غالباً اُس کا جی بھرنے لگا تھا۔۔۔ لاکھ مذاہیر اختیار کرنے کے بعد بھی میناکشی اُمید سے رہی۔ وہ چاہنے لگی کہ اُس کی گود بھی آباد ہو۔ باتوں باتوں میں موہن کمار کو اصلیت کیا بتادی کہ پُر امن ماحول میں اضطراب اور پریشانی کے بادل منڈلانے لگے۔ موہن کمار کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اُس کی عزت و مرتبہ کی چادر تارتار ہونے لگی۔ لیکن ہوش و حواس سنبھالے موہن کمار نے زبان وا کر دی۔

”دیکھو میناکشی یہ مذاق چھوڑ دو! یہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ ویسے تمہارے لئے شادی ایک قید سے زیادہ نہیں! تمہیں شادی اور بچے کا خیال ہوتا تو اپنے پتی سے ناٹھ نہ توڑتی۔“

”موہن تم یہ کیا کہہ رہے ہو“ میناکشی بات کاٹتے کہہ گئی۔

”میں نے اپنا سب کچھ تمہارے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔“

اس کا مجھے یہ صلہ مل رہا ہے“

”صلہ نہیں بلکہ تمہیں اپنے کئے کا پھل مل رہا ہے۔ ایک

بستر کی زینت نہ بن کے تم نے بازاری عورت کا روپ

دھار لیا۔ میں نے بھی بہتی ندی میں غوطہ لگایا تو اس کا

مطلب یہ نہیں کہ تم سے شادی کر لوں۔ اپنی وقعت کو
بچاؤ

”یہ تم کہہ رہے ہو موہن“ میناکشی کی حالت غیر تھی۔

”ہاں میں کہہ رہا ہوں۔۔۔ میناکشی میں تمہاری کوئی مدد

نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر تم شادی و بچہ کا معاملہ ترک کر دو تو

ہمارا یہ جذباتی رشتہ برقرار رہ سکتا ہے۔“

موہن کمار کا رویہ بھانپ کر میناکشی کا چہرہ مڑ جھا گیا۔ یاسیت کے آثار ماتھے پر

واضح طور نمودار ہونے لگے۔۔۔ مستقبل کے ڈراؤنے خواب آب و تاب کے ساتھ سامنے

رقص کرنے لگے۔۔۔ وہ اور اُس کی ہوش مندی ایک ساتھ ڈمگانے لگی۔۔۔ اُس کا ”ماں

بننے کا خواب“ خیالات کے محل کی طرح مسمار ہو کے رہ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وفور غم و

یاسیت میں اُس کی کوکھ میں موجود بچے کا کچا وجود خون کے لوتھڑوں کی صورت گھر درے

فرش پر ادھر ادھر بکھر کے رہ گیا۔



پترہ بختی

”ذرا ہمت سے کام لو“

وقار نے زبیدہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا

راستہ بہت دُور تک چلا گیا تھا۔۔۔ دُور دُور تک کشادہ صاف و شفاف اور چمکتا ہوا فرش۔ یہ راستہ اُن کمروں کی طرف جا رہا تھا جو دودھیاروشنی میں نہائے ہوئے تھے۔
”اُف! میں اس حالت میں اتنی دُور نہیں چل سکتی“

زبیدہ نے مری مری سی زبان میں کہا

”میں سہارا دوں گا تمہیں“۔ وقار اپنا تھکے بھرے لہجے میں بولا۔

”تو بہ کیسی باتیں کرتے ہو۔ دیکھنے والے کیا خیال کریں گے“

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔“

ساتھ ہی وقار نے ہاتھ بڑھا کر اپنے بازوؤں پر اُسے اٹھانا چاہا۔ لیکن زبیدہ پیچھے ہٹ گئی۔

”اچھا نہ سہی! مگر کم از کم میرا سہارا تو لے لو“

یہ کہتے ہوئے وقار نے کمر کے گرد اپنا بازو ڈال کر زبیدہ کو مضبوطی سے تھام لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگے

زبیدہ کے جسم میں رہ رہ کر ٹیسس اُٹھ رہی تھیں وہ چند قدم طے کرتی اور درد کی شدت سے تڑپ جاتی۔ سارے بدن میں ایک کپکپاہٹ سی طاری ہوتی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے تیرنے لگتے۔

”اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دو! تمہیں چلنے میں آسانی ہوگی“

وقار نے آہستہ سے کہا

بدلے میں زبیدہ نے لاج کے مارے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر وقار کے کندھے پر ڈال دیا۔۔۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کمرہ تشخیص کے نزدیک پہنچ گئے۔
نرس زبیدہ کو اندر لے گئی اور وقار باہر کھڑا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد وہ بیچ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔

”یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔۔۔ یہ تو وقت سے پہلے ہی تھا۔ زبیدہ شام کو اچھی بھلی تھی۔ وہ حسب معمول تھا کماندہ گھر لوٹا تھا۔۔۔ زبیدہ دہلیز پر بیٹھی تھی اور ایک دلفریب مسکراہٹ سے وقار کا استقبال کیا تھا۔ پھر پانی کا گھڑا بھر لائی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں دھلوائے تھے۔ کتنی خدمت گزار ہے زبیدہ۔ وقار کے سینے میں شکر و محبت کے جذبات اُٹھ آئے۔۔۔ اور وہ اکلوتی بچی فریدہ کے ہمراہ زبیدہ کے اصرار پر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

ہمیشہ کی طرح وہی رُو کھا سو کھا کھانا۔

زبیدہ اٹھی اور رسوئی گھر کی طرف گئی۔ کچھ قدم چل کر وہ اچانک چکرا کر بیٹھ گئی۔۔۔ وقار کھانا چھوڑ کر اُس کی طرف بھاگا۔ اور نہایت بے قراری اور کرب سے پوچھا کہ یہ اچانک اُسے کیا ہو گیا ہے۔۔۔ مگر زبیدہ ٹالتی رہی۔ اور انکار کرتی رہی کہ اُسے کچھ ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح اپنی ہر تکلیف وقار سے مٹھپاتی رہی تھی۔۔۔ زبیدہ بار بار اپنا منہ گھٹنوں میں چھپائے بیٹھی رہی تاکہ اُس کی تکلیف بھانپ کر وقار پریشان نہ ہو۔۔۔ آخر بار بار اصرار کرنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کی طبیعت بہت خراب لگ رہی ہے۔ اور عالم

پریشانی میں وقار زبیدہ کو ہسپتال لے آیا۔

خدا کرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

وقار نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ اُس پر دیوانگی سی طاری تھی۔ کبھی وہ بے تاب ہو کر ٹہلنے لگتا۔ پھر آ کر بیٹھ جاتا۔ اُسے کچھ بھی سوچھائی نہ دے رہا تھا۔ لیکن کان دروازے پر لگے تھے اتنے میں دروازہ کھلا

زبیدہ کو اسٹچر پر لٹایا گیا تھا۔ اور اسٹچر اہل کار آپریشن تھیٹر کی جانب لے گئے۔ زبیدہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے وقار کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند کیا گیا۔ دفر غم میں وقار زبیدہ سے بات بھی نہ کر سکا۔ تھیٹر سے وابستہ کمرہ میں بلا کر ایک فارم پر وقار کے دستخط کرائے گئے تاکہ آپریشن کرانے سے متعلق کارروائی پوری ہو سکے۔

غم و اندوہ کی تصویر بنا وقار دوبارہ بیچ پر تسلط جما گیا۔ طرح طرح کے خیالات اُس کا رہا سہا قرار لوٹنے لگے۔۔۔ کتنی کمزور ہے وہ۔۔۔ کیا سب کچھ برداشت کر پائے گی۔

وقار نے دروازہ سے کان لگا کر آواز سننا چاہی مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ صرف قدموں کی مدھم چاپ کے ساتھ ساتھ اوزاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تھیٹر اسٹنٹ نے وقار کو تسلی دی اور وہ پھر سے بیچ پر بیٹھ گیا۔

سزبیدہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس ناقابل برداشت تکلیف کو سہتی رہی۔۔۔ اور پھر اُس پر بے ہوشی طاری ہوئی۔۔۔۔۔ ڈاکٹروں نے پیٹ چاک کر کے بچہ باہر نکالا۔ نوزائیدہ کے نحیف بدن میں رتی بھر جان باقی تھی۔ چند لمحوں کے لئے زندہ رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

زبیدہ کو اب کچھ کچھ ہوش آ رہا تھا۔ اُس نے بچے کے متعلق کچھ نہ پوچھا جیسے کسی چھپی ہوئی حس نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔

نرس اُسے تسلی دینے لگی۔۔۔ ”بچہ مر چکا ہے۔ آٹھویں مہینے میں جو بھی بچے پیدا ہوتے ہیں عموماً زندہ نہیں رہتے“

پھر نرس نے بچے کو اٹھا کر اُسے دکھایا۔ زبیدہ نے مری مری نظروں سے اُسے دیکھا زرد چہرہ۔۔۔ نازک نقش۔۔۔ سُکھا بے جان جسم زبیدہ نے آنکھیں پھیر لیں۔
ممتا کی گرم گرم دھارا جو نئے سرے سے اُٹھ کر اُس کے سینے میں مچل رہی تھی سرد ہو کر یکدم منجمد ہو گئی۔

وقار کی بے قرار نظریں ابھی تک دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔

پھر دفعتاً دروازہ کھلا

نرس باہر آئی۔ وقار بڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ نرس نے بتایا کہ بچہ نہ بچ سکا۔

لیکن وقار کو بچے کی بالکل پرواہ نہ تھی۔ اُس کے دماغ میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ کاش زبیدہ بچ جائے۔ اُس نے پاگلوں کے انداز میں نرس سے پوچھا۔
”وہ کیسی ہے“ اور جواب کا انتظار کئے بغیر اندر گھسنے لگا۔ تو نرس نے ڈانٹ کر کہا۔

”ارے۔۔۔ ارے کہاں جا رہے ہو تم۔ ابھی اندر نہیں

جاسکتے۔ جاؤ پہلے جا کر اُس کے لئے قہوہ بنا کر لے آؤ۔“

”کیا کہا قہوہ! تو کیا وہ زندہ ہے۔ خداوند لا کھلا کھ شکر ہے تمہارا“

جب وقار قبوہ لے لکڑیا تو زبیدہ کو وارڈ میں پہنچا دیا گیا تھا وہ بستر پر خاموش اور
بڈھال پڑی تھی۔ اُس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر وقار نے اپنائیت بھرے لہجے میں
پوچھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“

زبیدہ کے خشک لبوں پر ایک کمزور پھکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور آہستہ سے
لب ہلے
”اچھی ہوں“

شفقت دیوار کے ساتھ وقار زبیدہ کے لاغر جسم کو دیکھ رہا تھا اُس نے بچے کے
بارے میں کچھ نہ کہا۔ خیر جس کے لئے اُس نے خدائے برتر سے دُعا مانگی تھی وہ بچ گئی تھی۔
اس سے زیادہ اُسے اور کچھ نہیں چاہئے تھا۔ قبوہ کے کچھ گھونٹ اُس کے حلق میں ڈال دیئے
اور پھر زبیدہ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی۔

یوں تو زبیدہ میں کوئی جسمانی کشش نہ تھی۔ نوجوانی میں جو ذرا کشش اور حُسن
تھا وہ غربت نے اُسے چھین لیا تھا۔ اُس کا رنگ بھی وقت کے تھپیڑوں کی وجہ سے پھیکا
پڑ گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئیں تھیں اور اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔۔۔ پچیس
سال کی عمر میں ہی زبیدہ عمر رسیدہ نظر آنے لگی تھی۔

اگلے روز وقار سات سالہ بچی فریدہ کو ساتھ میں لایا۔ زبیدہ کی حالت میں کوئی
تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ فریدہ ماں کے سر ہانے کھڑی ہو گئی اور بڑی بے تابانی سے سوال
کرنے لگی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے اماں۔۔۔ بتاؤ تو کیا ہو گیا ہے؟“

”تمہاری امی کو تو بخار ہے“

وقار نے زبیدہ کی پیشانی چھوتے ہوئے کہہ دیا۔

”ماں! اپنا ہاتھ مجھے دو! میں چوم لوں تو تم جلدی اچھی ہو جاؤ گی“

اس کے ساتھ ہی فریدہ ماں سے لپٹ گئی۔

زبیدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ سوچنے لگی کہ کتنا پیار کرتی ہے یہ معصوم مجھ سے

۔۔۔ ویسے اس نے زندگی میں کون سا سکھ پایا ہے۔۔۔ سوائے غربت، بھوک اور

مصیبت کے۔۔۔ لمحہ بھر کو بھی چین نصیب نہ ہوا۔

اُسی شام جب وقار دودھ اور ڈبل روٹی لے کر زبیدہ کو دیکھنے ہسپتال آیا تو وہ

بندہال سی پڑی تھی۔ کل والی شگفتگی تو بالکل غائب تھی۔ چہرہ یکدم زرد اور کمزور پڑ گیا تھا۔

انتاز رد کہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اُس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وقار نے ذرا

جھک کر آہستہ سے اُس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

”اُف کتنا سرد ہے یہ ہاتھ“ بے اختیار اُس کے منہ سے نکل گیا۔

زبیدہ نے تھکی ہوئی آنکھیں بہ مشکل کھولیں۔ اُن آنکھوں میں مایوسی اور ویرانی

صاف طور سے جھلک رہی تھی۔

اتنے میں لیڈی ڈاکٹر اور نرس ہال میں داخل ہوئیں۔ بیڈ نمبر ۶ کے قریب آ کر

نرس نے زبیدہ کے انگوٹھے سے کچھ قطرے خون کے نکالے۔۔۔ خون کی جانچ کرانے

کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے وقار کو اپنے کیبن میں بلایا۔

”جانتے ہو تمہاری بیوی کس نازک حالت میں ہے۔ اگر حمل کے

دوران میں اُسے دودھ، پھل، اور ٹانک وغیرہ دئے ہوتے تو آج اس حالت میں نہ

پہونچتی۔۔۔ جب بے چاری موت کے منہ میں پہنچ گئی تو اسے ہسپتال لے آئے۔۔۔
اس کی موت۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔ نہیں ڈاکٹر صاحبہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔“

وقار نے غیر ارادی طور بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”جس طرح بھی ہو سکے آپ میری بیوی کو بچا لیجئے، میں

ہر طرح کا خرچ برداشت کروں گا۔“

اور پھر وقار نے کچھ ادویات و انجکشن حسب ہدایت بازار سے خریدنے کے لئے اپنے یار غار احمد سے قرض لیا۔۔۔ ایک معمولی کلرک اور پھر ایک بچی کا باپ اور کرایہ کا فلیٹ۔۔۔ مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ اُس نے دفتر تبدیل جانا شروع کیا۔۔۔۔۔ سگریٹ پینا اور اخبار خریدنا چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ انہی چند سکوں سے وہ زبیدہ کے لئے پھل خرید لیتا۔
ہسپتال میں علاج باقاعدہ ہوتا رہا۔

اس کے باوجود زبیدہ برابر اُداس سی پڑی رہتی۔ چہرے کا رنگ سفید سے سفید تر ہوتا گیا۔ خون کی کمی کی وجہ سے اُس کے ہاتھ پاؤں اس قدر سرد ہو گئے تھے کہ اُن میں گرمی قائم رکھنے کی خاطر اُون کے دستا نے موزے چڑھائے جاتے اور گرم پانی کی تھیلیاں اُن کے نیچے رکھی جاتیں۔

زبیدہ کے چہرہ پر مانو موت کی سی سفیدی چھا گئی تھی۔

”تم بالکل فکر نہ کرو۔ بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔۔۔ تم

ضرور اچھی ہو جاؤ گی۔“

وقار اُسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔ بدلے میں ایک پھسکی اور اُداس سی مسکراہٹ

زبیدہ کے سوکھے لبوں پر ابھر آتی۔

آخر وہ رات بھی آگئی جو زبیدہ اور وقار کے لئے قیامت سے کم ثابت نہ ہوئی۔۔۔۔۔ زبیدہ اب تک ہر تکلیف خاموشی اور صبر سے برداشت کر رہی تھی۔ لیکن اب بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ کرب کے مارے کراہ رہی تھی۔ وقار جانے لگا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اُس نے آج رات وہیں پر رہنے کے لئے نرس سے بہت منت سماجت کی۔ لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔

”یہ ہسپتال کے قانون کے بالکل خلاف ہے کہ زنانہ وارڈ میں مرد رات کو قیام کرے۔ تم نے اسپیشل کمرہ تھوڑے لے رکھا ہے“

وقار مجبوراً زبیدہ کو بے بسی کی حالت میں چھوڑ کر رات دیر گئے واپس لوٹا۔ اُس رات درد کے مارے زبیدہ کراہتی و تڑپتی رہی۔ وابستہ وارڈ کی نرس نے آکر اُسے ڈانٹا۔

”تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ دوسرے مریضوں کی نیند

خراب ہو رہی ہے۔ کیوں اتنا چلاتی ہو“

صبح سویرے وقار نے ہسپتال کا رخ کیا۔

زبیدہ خاموش اور پُر سکون پڑی تھی۔ جیسے اب اُس میں کراہنے کی سکت نہ رہی ہو۔۔۔۔۔ یا اُسے اب آرام ہو۔۔۔۔۔ وقار سوچنے لگا کہ اب زبیدہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی،۔۔۔۔۔

اس کے برعکس ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کرخٹ لہجے میں کہا

”اب تو صرف ایک ہی راستہ ہے“

وہ کیا ڈاکٹر صاحب“ وقار نے پوچھا

”یہ کہ اس کے جسم میں خون داخل کیا جائے“

وقار فوراً ہی اپنا خون دینے کے لئے تیار ہو گیا۔

خون کا ٹیسٹ کیا گیا۔ گروپ ملنے پر پاس میں کھڑے ڈاکٹر نے تعجب سے وقار

کی طرف دیکھا۔

”یہ کمزور اور سُوکھا سا انسان، اس کے جسم میں کتنا خون

ہوگا جو بیوی کو دے گا۔“

”آپ میری فکر نہ کریں! اگر میرا خون اسے زندہ رکھ سکتا

ہے تو میں اپنا سارا خون دینے کو تیار ہوں“

وقار بے تامل کہہ گیا

الغرض وقار کے جسم سے گرم گرم خون نکالا گیا۔ خون زبیدہ کے سوکھے جسم میں

داخل کیا گیا۔ یکدم اُس کی سکڑی ہوئی رگوں میں گرمی کی لہر دوڑنے لگی۔۔۔۔۔ لبوں پر

خفیف سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔۔۔۔۔ وقار یہ تبدیلی بھاپے خوش ہونے لگا کہ آخر اُس

کا خون دینا رائیگاں نہیں گیا۔

دفعتاً زبیدہ نے آنکھیں کھولیں۔ پیار سے وقار کی طرف دیکھا۔ پھر خفیف آواز

میں کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی حالت

دگرگوں ہو گئی۔ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کچھ کہنے کے لئے اُس نے ہونٹوں کو حرکت دی۔ لیکن آواز

حلق میں انک کر رہ گئی۔

وقار اُس پر جھک گیا۔ فقط ہونٹ پھڑپھڑاتے رہے۔ بے بسی کے عالم میں زبیدہ ادھر ادھر کھوجنے لگی۔۔۔ شاید وہ فریدہ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ سوچتے وقار تیزی کے ساتھ گھر کی جانب بھاگا اور فریدہ کو لے آیا۔

زبیدہ نے حسرت بھری نظروں سے فریدہ کو دیکھا اور پھر پیار کرنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا مگر کمزوری کے باعث ہاتھ بستر پر گر پڑا۔۔۔ اسی حالت میں کچھ وقت گذرا۔۔۔ پھر اُس نے وقار پر نظر ڈالی۔۔۔ آنکھوں آنکھوں اُس سے رخصت طلب کی۔۔۔ اور خدا حافظ زبیدہ سدا کے لئے اِس دنیا سے چلی گئی۔۔۔ بہت دُور۔۔۔۔۔ ایک اور زندگی ختم ہوگئی۔۔۔۔۔ وقار کا سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ بچوں کی طرح مٹھوٹ مٹھوٹ کر رُونے لگا۔۔۔۔۔ وقار اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ فریدہ روتے روتے بے جان جسم سے لپٹ گئی۔۔۔ موت کا راز اُس معصوم کی سمجھ سے باہر تھا۔

نرس نے زبیدہ کے جسم کو سیدھا کیا اور رنگین کمبل ہٹا کر اُس پر سفید چادر اوڑھادی۔

سکتے کے عالم میں کھڑا وقار شریک حیات کو گھورتا رہا۔ اُس کے تمام حواس شل ہو چکے تھے۔ پھر اُس کے کانوں میں آواز آنے لگی۔

”اب تو رات کافی گزر چکی ہے۔ غش تمہیں صبح ہی ملے

گی۔ ہم جو کچھ کر سکتے تھے کر چکے، باقی ہمیں تمہاری بیوی

کے مر جانے کا بہت افسوس ہے۔“

لیڈی ڈاکٹر اتنا کہہ کر نرس سے مخاطب ہوئی۔

”خاکروہوں سے کہہ دو کہ لاش اٹھا کر مُردہ خانے میں ڈال آئیں“

کچھ دیر بعد دو خاکروب حاضر ہوئے۔ پر انہوں نے ایک زبان ہو کر اعلان کیا کہ لاش اٹھانے کے بیس روپے دیئے جائیں۔

یہ منظر دیکھ کر وقار بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس سے زیادہ لاش کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ اور اپنی تمام تر قوت کو یکجا کر کے اُس نے زبیدہ کے مردہ جسم کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا۔ نرس نے اسٹیجر آگے بڑھایا تو وقار درد و کرب سے چلایا۔

”ہٹ جاؤ سامنے سے، کوئی ضرورت نہیں اسٹیجر کی“

اور پھر وارڈ میں موجود مختصر مجمع کو چیرتا ہوا وقار ہسپتال کے ماحول سے باہر نکل آیا۔ کسی ایک نے بھی مداخلت نہ کی۔ فریدہ باپ کی قمیض کا کنارہ پکڑے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

جان سے عزیز زبیدہ کے بے حس جسم کو کفن خانے اور دفنانے سے فراغت پائے وقار اپنے آپ سے بے نیاز سکتے کے عالم میں کھڑا اور خلاؤں میں بے مطلب کچھ کھوج رہا تھا کہ دفن فریدہ بیٹی نے اُس کے دامن کو جھنجھوڑا

”لو میری اماں کہاں گئی۔ اُسے بلاؤ“

لو۔ میں اُسے تنگ نہیں کروں گی۔ میں

ثانی بھی نہیں مانگوں گی۔“

وقار نے زبیدہ کی نشانی کو سینے سے لگایا اور اپنی برگشتہ بختی پر ماتم کرنے لگا۔



صدائے بازگشت

یقین مانو راشدہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم سامنے نہیں ہو، میں تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اکثر اوقات خلوت میں تم سے باتیں کیا کرتا ہوں۔ ادھر جس دن سے ملازمت اختیار کر لی ہے۔ میرے دل و دماغ پر دفتر کی فائلیں اور گہما گہمی چھائی ہوئی ہے دماغ اس بدلے ماحول میں وحشت ناک قبرستان لگ رہا ہے۔ بہر حال اس سنسان قبرستان میں تمہارا گذر ہو ہی گیا۔ میں پھر اپنے اندر ان جذبات کو بُری طرح محسوس کرنے لگا جو فقط تمہارے لئے وقف تھے۔ اور ہم ایک بار پھر جھیل ڈل کی وسیع و عریض گود میں واقع چھوٹے سے جزیرے کے کنارے ایک دوسرے کے روبرو تھے، گھنے چنار کے نیچے نرم نرم قالین نما گھاس پر بیٹھے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگے۔

یاد ہے، چاند نے اپنی نورانی صورت لئے ہر شے کو منور کر دیا تھا۔ ہمارے سامنے دُور دُور تک پھیلا صاف و شفاف پانی کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ اس جھیل میں راشدہ تمہارے خیالات کی وسعت تھی۔ تیری دل فریب آنکھوں کی نیلا ہٹ اور تمہارے دل کی گہرائی تھی۔ اس دل آویز جھیل میں دیکھتے ہی دیکھتے چھوٹی چھوٹی موجیں نمودار ہوئیں اور ہر موج میں مانو ایک چاند ڈوبا ہوا تھا۔۔۔ چاندنی میں ملبوس موجیں ناچتی اُچھلتی اور کودتی ہمارے قدموں تک آرہی تھیں اور اپنے ساتھ لائے چاند کو ہمارے قدموں میں چھوڑ کر

واپس جا رہی تھیں۔ نہ جانے کتنے چاند ابھرے تھے جو اس جھیل کی بسیط گود میں دم توڑ رہے تھے۔ لیکن میں ان لوازمات سے بے نیاز تمہارے چہرے کو نکلتا تھا۔ پُرازد جذبات چہرہ، کالی کالی چمکدار آنکھیں۔۔۔ یا قوت جیسے لب، کشادہ پیشانی اور برسات کی راتوں کی طرح سیاہ اور گھنی زلفیں۔۔۔ میں بت بنا تمہیں تک رہا تھا۔۔۔ کچھ یاد ہے مجھے سکتے کے عالم میں دیکھ کر تم جھینپ سی گئی اور اس کے مٹانے کی خاطر تم سامنے والی پہاڑی کے دامن میں واقع خوشنما بنگلوں کو ٹھیسوں کو دیکھ کہنے لگی۔ ”شادی کے بعد تم بھی ایک ایسا بنگلہ بنا دینا“

”یہ سب سرمایہ داری کے محل ہیں جو لاچاروں اور غریبوں کا خون چوس کر تعمیر ہوئے ہیں یہ ریت پر کھڑے ہیں۔ ہمارا محل تو محبت کی سنگلاخ زمین پر تعمیر ہوگا۔“ میں نے بے تامل جواب دیا تھا۔

تم حسبِ عادت روٹھ گئیں میں نے فرطِ محبت میں اپنا سر تمہاری گود میں رکھ کر لیٹنے کی کوشش کی۔ تمہاری نظریں جھک گئیں اور پھر میرے اُلجھے ہوئے بے ترتیب بالوں میں اپنی نرم و نازک انگلیوں سے کنگھی کرنے لگیں۔ اُف کتنا سکون اور آرام مجھے اس وقت ملا تھا۔ جب تم نے اپنا ماتھا میری پیشانی پر رکھ دیا تھا۔

۔۔۔۔۔ تم میرے بالوں سے بدستور کھیل رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا ان عالیشان محلوں کے بارے میں اور پہاڑی کے دامن میں جھیل کے کنارے پھیلے جھونپڑیوں کے بارے میں۔ میں کلب والی عالیشان بلڈنگ کو دیکھ رہا تھا جسکی وسعتوں میں چند فرنگی اور نیم مشرقی مرد و خواتین زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔۔۔۔۔

اُف تفریق کی کیسی گھناؤنی تصویر ہے کہ ایک طرف ہزاروں خاندان جھوپڑوں میں بے سرو سامانی کے عالم میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔۔۔ انہیں سر چھپانے کو جگہ نہیں ملتی اور دوسری طرف رقص کا بازار گرم ہے۔ شراب کے پیالوں کی جلت رنگ بج رہی ہے۔ اس کلب ہال میں سینکڑوں خاندان پناہ لے سکتے تھے۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اس ناچ و رنگ کے مقابلے میں ان ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بے وقعت ہیں، یہ کلب سرمایہ داروں کے لئے عیش و عشرت کا سامان فراہم کر رہا ہے لیکن یہ دیر پا نہیں۔۔۔ میرے نزدیک ان محلوں سے لاکھ بہتر وہ جھوپڑے ہیں جو مکرو فریب کی بستی سے دور اپنائیت کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں۔

”اگر تم راضی ہو تو ان جھوپڑوں تک تمہارا ساتھ دوں“۔ یہ تم بولیں۔

”ان جھوپڑوں میں پھیلاؤ ہے راشدہ! ان کی گود میں انسانیت پلتی ہے۔

ہاں ہاں ان جھوپڑوں میں لا چاری اور مفلسی کے مدھر مدھر نغے سننے کو ملتے ہیں۔۔۔۔۔ یقین کر لو مستقبل قریب میں ان جھوپڑیوں میں قیام پذیر افراد ساری دنیا پر راج کرینگے۔“

”تو پھر پہاڑی لڑکی سے شادی کیوں نہیں کرتے“۔ تم نے بیزاری کے عالم میں مشورہ دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔۔۔ اور ان آنسوؤں میں ایک پہاڑی لڑکی کا وجود ابھرا۔ اُس کا نام گل جان تھا جس کا جنم جھوپڑے میں ہوا تھا۔ پتھروں اور آبشاروں سے کھیلتی جوان ہو گئی تھی۔ گل جان بہادر اور جفاکش لڑکی تھی اور تمہاری طرح خوبصورت بھی۔۔۔ سورج نکلنے اور ڈوبتے تک بوڑھے باپ کا ہاتھ بٹاتی۔۔۔ کچھ وقت پہلے گل جان اپنے دو بھائیوں، بہن اور والدین کی شرکت میں بشت بھری زندگی گزر رہی تھی لیکن

گیا تھا۔۔۔ تم برابر خاموش تھی۔۔۔ غالباً میرے ہر جانی پن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

یقین کر لو راشدہ میں ہر جانی نہیں ہوں نہ تھا۔

اتنے میں تم میری باہوں سے جدا ہو گئیں۔۔۔ میں سکتے کے عالم میں غرق راشدہ اپنی بے بسی پر ماتم کرنے لگا۔۔۔ اُف دیکھتے ہی دیکھتے راشدہ میرے خیالات کی لڑی ٹوٹ گئی۔۔۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم مجھے ٹھکرا کر کسی اور کے نشیمن کو روشن کرنے کی حماقت نہیں کرو گی۔۔۔ تمہاری طرف سے خاموشی برابر جاری ہے۔۔۔ یہ خاموشی راشدہ مجھے بے موت مارے گی۔ خدا را از راہ انسانیت اس خاموشی کو توڑ دو۔۔۔ مجھے سہارا دو!

فقط تمہارا شہباز

☆☆☆

ایک پہلو یہ بھی ہے

امتیاز غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اُس کے والد بختیار احمد مقامی ابراہیم کارخانہ میں ادنیٰ درجے کے ملازم تھے۔ امتیاز کے علاوہ دو بیٹیوں کے پالن پوشن اور شریک حیات کی مسلسل بیماری کے باعث بختیار کو اقتصادی بحران نے بُری طرح اپنے چنگل میں لے رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کم سنی میں ہی دونوں لڑکیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے بجائے سلائی اور بُنائی کے مقامی سینٹر میں سوزن کاری کا ہنر سیکھنے کی غرض سے داخلہ لینا پڑا۔ شالوں اور ادنیٰ کپڑوں پر گُل کاری کرنے میں دونوں بہنوں نے زبردست مہارت حاصل کر لی۔۔۔ ماں تو پہلے پہل چرخہ کا تا کرتی تھی۔ لیکن تپ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث وہ یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکی۔ اب تو یہ حالت تھی کہ معمولی سی محنت کا کام کرنے سے اس کی چھاتی میں درد اُٹھتا تھا۔ اور سانس پھولنے لگتی تھی۔

ایک نیم مذہبی ادارے سے وظیفہ حاصل کرنے اور اخبار کی ایجنسی سے اخبارات و جرائد اٹھائے بستی کے متمول گھرانوں میں صبح سویرے ڈالنے کے عوض امتیاز کو کچھ آمدنی بھی ہونے لگی۔ جس کے باعث وہ تعلیم و تربیت کے میدان میں متوازن انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امتیاز نے گریجویشن کا امتیازی
زینہ بلاسکی وقت کے طے کر لیا۔

بختیار کی کوششوں سے امتیاز کو ابریشم کارخانے میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ دیگر
اوصاف کے علاوہ امتیاز میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ دن بھر کی روئیدارات کو سونے سے
قبل ڈائری میں قلم بند کر لیا کرتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امتیاز کا کاغذ داغدار کرنے کا جذبہ خوب جوہر
دکھانے لگا۔ اب اخبارات و دیگر جرائد میں اُس کی تحریر کردہ مقالے اور سیاسی و سماجی طرز
کے مضامین شائع ہونے لگے۔ انفارمیشن آفیسر حاجی عبدالستار کے اکلوتے بیٹے انور کو
پڑھانے کے بدلے اُسے معقول معاوضہ ملنے لگا۔ غرض اس طرح امتیاز اپنے والدین کا
ہاتھ بٹانے میں کامیاب اُترا۔

حاجی عبدالستار کی سفارش پر امتیاز ایک غیر ملکی معروف ریڈیو اسٹیشن کے لئے
نمائندہ خاص کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں امتیاز کلرک کی
ملازمت کو خیر باد کہہ کر وقایع نگار کے طور پر شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ پریس کالونی
میں اُسے کوارٹر کے ساتھ ساتھ ٹیلی فون اور اسکوٹر جیسی بنیادی سہولیات بہ آسانی حاصل
ہو گئیں۔

تحریر کی دور میں امتیاز نے اچھا نام کمایا۔ سرکاری و غیر سرکاری تقریبات کے علاوہ
فوجی عسکری اور تحریر کی کاروائیوں کی بابت اُس کی رپورٹنگ و تبصروں کی سراہنا کی جانے
لگی۔ دراصل کسی بھی عسکری یا سیاسی واردات کو جاہ و نمود کی خاطر بڑھا چڑھا کر پیش کرنے
سے وہ سدا ہی دور رہتا تھا۔ ہر واقعہ کی اصلیت جاننے کی چاہ میں پابندیوں و خطرات کے

باوجود امتیاز بڑی ہمت و حوصلے کے ساتھ جائے وقوع پر پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ کچھ اعلیٰ فوجی و عسکری ذمہ داران کے ساتھ اس کا رابطہ بنا ہوا تھا۔ جس کے باعث امتیاز کو اپنے فرائض ادا کرنے میں کسی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

کشمیری قوم کو یہ علت غالباً ورثہ میں ملی ہے کہ جب کوئی فرد محنت و مشقت کے بل پر ترقی و کامرانی کی منزلیں طے کر لیتا ہے تو اس کے اکثر واقف کار یا ہمسایہ لوگ خوش ہونے کے بجائے من ہی من جل اُٹھتے ہیں۔ امتیاز کو بھی اس ناروا سلوک کا ہدف بنا پڑا۔ انتھک محنت کے بدلے حاصل کردہ کمائی سے امتیاز نے ماڈرن ہاؤسنگ کالونی میں عالی شان بنگلہ تعمیر کرایا۔ ساتھ ہی پولیس کمپلیکس میں دفتر کے لئے موزون جگہ دستیاب ہوئی۔ کچھ تنگ نظر احباب کی آنکھوں میں امتیاز کی یہ کامیابی کانٹے کی طرح کھلنے لگی۔

ایک روز درجن بھر وردی پوش جوان دفتر میں گھس آئے اور امتیاز کو حراست میں لیے ون ٹن میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ پولیس اور میڈیا مراکز میں سراسمگی سی پھیل گئی۔ ملکی و مقامی اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے امتیاز کی بے وجہ گرفتاری کا خوب چرچا رہا۔ جس کے نتیجے میں امتیاز کو تین دنوں کے بعد ہی رہا کیا گیا۔ البتہ زیر حراست کچھ زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ بھی اس بات کو لے کر کہ امتیاز کا کچھ تحریر کی و عسکری زعماء سے رابطہ بنا ہوا ہے اور ان کی سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔

حسب سابق امتیاز کی تحریر کردہ بے باک اور جاندار تبصرے میڈیا اور اخبارات کی زینت بنتے گئے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلتے گئے۔ مختیار منزل رنگ برنگی روشنی کے لاتعداد قلموں سے بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ امتیاز کی بڑی بہن رضیہ کی شادی خانہ آبادی کی رسومات دھوم دھام کے ساتھ انجام دی گئیں۔ رخصتی کی تقریب میں کچھ

سیاسی، عسکری اور سماجی ہستیوں کے علاوہ ذرائع ابلاغ کے اراکین اور کچھ نامی گرامی صحافیوں نے شرکت کی۔ دراصل امتیاز کے لنگوٹے یا رانجینئر اسد اللہ ریاض سے شادی رچائی گئی۔ امتیاز نے اپنے والدین اور چھوٹی بہن رفیقہ کے ہمراہ رضیہ کو خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

اگلی رات دیر گئے جب کہ رضیہ کہ عارضی جدائی کے غم میں گھر کے مکین اُداس اُداس سے بیٹھے تھے۔ اچانک صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ امتیاز نے جلدی سے دروازہ کھول دیا یہ دیکھ کر قد رے حیرت ہوئی کہ سامنے دو نقاب پوش کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ایک نقاب پوش آگے بڑھا اور زبان دا کر دی۔

”ہمارے عسکری زعیم کو فورسز کے جوانوں نے زور کو ب کر کے چنار باغ میں ادھ مرا چھوڑ دیا ہے حالت کافی نازک ہے۔ وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ جلدی ہمارے ساتھ چلئے۔“

امتیاز نقاب پوش کی بات سن کر پریشان سا ہوا۔ وقت ضائع کیے بغیر اپنا شیپ ریکارڈ اور کیمرا اٹھایا۔ اور تھری ویلر میں بیٹھ کر طوفان کی مانند گھر والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رات پریشانی کی حالت میں گزری۔ صبح ہوئی لیکن امتیاز واپس نہیں لوٹا۔ والدین و بہن کو تشویش ہونے لگی۔ طرح طرح کے وسوسے اور خیالات دل و دماغ میں اٹھنے لگے۔

میڈیا سے وابستہ آس پاس کے افراد انہیں دلاسا دے رہے تھے کہ اتنے میں یہ

دل خراش خبر سُننے کو ملی کہ امتیاز کی گولیوں سے چھلنی لاش چنار باغ کے قریب دریائے جہلم کے کنارے پڑی ہوئی ملی ہے۔ ہر طرف کہرام ساپا ہو گیا۔ ماتم کی صف بچھ گئی۔ لاغر ماں کی حالت بہت ہی زیادہ ابتر ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ فرش بوس ہوئی کہ پھر ہوش میں نہ آئی۔۔۔ اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

آخر امتیاز کو کس جرم کی پاداش میں یہ سزا ملی۔ دم سکت والد صرف سوچتا رہا، جان پہچان والوں کا یہی کہنا تھا کہ امتیاز کا قصور فقط یہ تھا کہ وہ عسکری و فوجی روئیداد کو اصلیت کے لبادے میں پیش کیا کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ کسی عسکری جماعت یا جنگجو گروہ نے امتیاز کو ہلاک کرنے کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

شریک حیات اور لخت جگر کے بے جان جسموں کو مقامی قبرستان میں دفنانے کے بعد بختیار دو بیٹیوں کے ساتھ اپنی بد نصیبی پر ماتم کرنے لگا۔ بیٹیوں فرط غم میں مٹھوٹ مٹھوٹ کر رونے لگے۔

تحریک کے کرتا دھرتا کے ساتھ ساتھ سرکاری انتظامیہ کے کچھ ذمہ داران نے امتیاز کی بے وقت اور پُر اسرار موت پر اظہار تعزیت کیا۔ صحافیوں اور وقائع نگاروں کی خاصی تعداد نے امتیاز کی اس بے رحمانہ موت پر احتجاجی علم بلند کیا۔ ذرائع ابلاغ کے ادارہ نے اس جانکاہ واقعہ کی خوب تشہیر کی۔ الغرض ہر ایک نے مرحوم امتیاز کے غم زدہ والد بختیار کے ساتھ پوری ہمدردی جتائی۔ اُسے دلا سہ دیتے رہے۔

اسی دوران ضلع حکام نے ریاستی سرکار کی جانب سے دو لاکھ روپے کی رقم امتیاز کے باپ کو دینے کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ یہ اعلان کیا ہوا کہ بختیار کے چہرے کا رنگ

بدلنے لگا۔ اس کے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ نہایت افسردگی کے عالم میں اس نے مری مری آواز میں کہا:

”صاحب۔۔۔ آپ دو لاکھ کی بات کرتے ہیں۔
 آپ مجھ سے چار لاکھ روپیہ لے لو۔۔۔ یہ ساری جائیداد
 لے لو۔۔۔ اور میرے بیٹے اور شریک حیات کو واپس
 لوٹا دو۔ آخر میرے بیٹے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔۔۔ اس
 نے حالات سے سمجھوتہ کر کے اصولوں کی ڈگر سے ہٹنے کی
 حماقت کبھی نہیں کی۔ میں پوری طرح سے لٹ گیا، اب جینے
 کے لئے میرے پاس رہا ہی کیا ہے۔“

اتنا کہہ کر بختیار دفور غم سے کٹی شاخ کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی
 دیکھتے مختصر نفوس پر مشتمل گھرانہ پھر سے ماتم کدہ میں تبدیل ہو گیا۔ رضیہ اور رفیقہ پر تو مانو
 مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں بہنوں کی حالت لوگوں سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ والد کی
 لاش کے پاس وہ دم بخود بیٹھی تھیں۔

الغرض ایک اور گھرانہ تباہ و برباد ہوا اور وہ بھی تحریک کی آڑ میں انسان اور
 انسانیت کو تہس نہس کرنے کی خاطر یہ دو پاؤں کا حیوان ناطق اور نہ جانے کیا کچھ گل
 کھلائے گا۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔



تصویر کا دوسرا رخ

فضاساکن تھی اور جنگل اُداس! ہر طرف سکوت۔۔۔ خاموشی کا عالم تھا۔ شام کے
 لگجے سائے پھیل چکے تھے۔ وہ کافی دیر سے بوڑھے چنار کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی تھی پھر وہ
 بے قراری اور اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ دور دور تک درختوں اور
 جھاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ پاس ہی ایک برفانی نالہ بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے
 کھلے بے ترتیب بالوں کو سمیٹا اور پاس پڑے بید کے ٹکڑوں کی مدد سے ناقص پٹا مکمل
 کرنے لگی۔ پٹا ابنتے بنتے اس کی آنکھوں میں پانی کے قطرے تیرنے لگے اور پلکیں بوجھل
 ہونے لگیں۔ وہ سوچ میں ڈوبی اپنے گرد و پیش کا غائرانہ طور پر جائزہ لینے لگی۔ وہ اب بھی
 کافی حسین و دلکش تھی۔ میانہ قد اور چھریرے بدن کی، دلکش خدو خال اور مسحور کردینے والی
 نگاہیں مگر اتنے اوصاف کی حامل ہونے کے باوجود وہ حد درجہ مضطرب رہتی تھی۔ پٹا اور بید
 کے ٹکڑوں کو کھوکھلے چنار میں چھوڑ کر وہ چشمے کی جانب بڑھنے لگی۔ پانی کے دو چار گھونٹ
 حلق سے نیچے اُتار کر وہ بڑے ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ جہاں سے بستی کے گھاس پھوس کے بنے
 ہوئے کئی چھپر صاف نظر آرہے تھے جس بستی کو خیر باد کہہ کر وہ اس سنسان بیابان میں رہنے
 لگی تھی۔ سرد آہ بھر کر وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اس پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگی جس نے
 اُسے یہاں آنے میں مدد کی تھی۔

وہ سوچ کے بحر بے کراں میں غرق تھی کہ پاؤں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔
 قدموں کی چاپ قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ اُدھ کھلی آنکھوں سے خوف زدہ ہرنی کی
 طرح چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”اب بھی تم میرا پیچھا نہ چھوڑو گے؟“

”کروں کیا راحت! یہ میرے بس کی بات ہو تب نا۔ میں
 سچ کہتا ہوں جب سے تم بستی چھوڑ کر چلی گئی ہو مجھے بستی
 اور بستی کی ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ راحت تم سے دور
 رہ کر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ مجھ
 پر یقین کرو۔“

”یقین وہ بھی ایک مرد پر؟“

”خدا جانتا ہے راحت میں دل لگی نہیں کر رہا۔ تمہارے
 بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ کھانا پینا نہ سونا میں نے
 کبھی اطمینان کا سانس نہ لیا۔ تم میرے سانسوں میں رچ
 بس چکی ہو۔ تمہیں اپنے قریب نہ پا کر میری حالت ابتر
 ہو جاتی ہے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔
 راحت تم میری زندگی ہو۔ میری دنیا۔۔۔۔۔“

”تمہاری دنیا؟ وہ بھی ایک عورت؟ نہیں نہیں“

”پلیز راحت مذاق مت اڑاؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے مجھ
 کم از کم وجہ تو بتا دو۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر میرا سکہ

چین لٹ گیا ہے۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اسی دن سے جب اس پہاڑی بستی میں قدم رکھا تھا اور تمہیں پن چکی کے پاس دیکھا تھا۔ یاد ہے راحت تم نے میرا ساتھ چودھری کے گھر تک دیا تھا۔ اسی گھڑی سے میں دل ہی دل میں تمہیں چاہنے لگا تھا کیا میری محبت پر تمہیں یقین نہیں؟ راحت بات ٹال کر مجھے بے موت مت مارو۔“

”محبت اور وہ بھی مجھ سے؟۔۔۔ واہ کیا بات کہی ہے۔ میں پھر کہتی ہوں اگر اپنی خیر چاہتے وہ تو میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں تمہاری یا کسی اور کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم سب خونی بھیڑیے ہو۔ وحشی درندے ہو۔ محبت کے نام پر بدنما داغ ہو۔ میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔“

”اور تم راحت؟“

”میں پوچھتی ہوں کہ میری فکر کرنے والے تم کون ہوتے ہو! میں جہاں ہوں جس حال میں ہوں تمہیں اس سے کیا واسطہ؟ اپنی خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں بھرگئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔“

”راحت میں تنہا واپس کیسے چلا جاؤں جب کہ تم سے

میری زندگی کی دھڑکنیں و سانسیں وابستہ ہیں“

”جھوٹ۔ ایکدم فضول و بے بنیاد تم چاہتے ہو کہ میں پھر
سے اس بستی کو اپنالوں جہاں عصمت و آبرو کے پیرہن
دولت و ہوس کے عوض تار تار کر دیئے جاتے ہیں۔

سنو! شہری بابو! یہ دنیا انسانوں کی بستی نہیں بلکہ حیوانوں کا
مسکن ہے۔ انسان کب کا مرچکا ہے۔ تم میری نظروں
سے دور ہو جاؤ۔ تم میرے ارادوں کو کسی طرح متزلزل
نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہارے احسانوں کی ضرورت نہیں۔

میرا خدا میرے ساتھ ہے۔“

اس کے ساتھ ہی راحت کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ ماتھے پر غم و غصہ کے
آثار واضح انداز میں اُبھرنے لگے۔ اس کا سارا جسم نامعلوم خوف سے لرزنے لگا۔ ایک
دل شکن یاد کے باعث راحت کے ہوش و ہوا س گم ہونے لگے۔ راشد نے راحت کو سہارا
دیتے ہوئے پھر کہا

”راحت تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کچھ منہ سے تو کہو۔ تمہاری

خاموشی مجھے مار ڈالے گی“

راشد نے راحت کو جھنجھوڑا اور پھر اس کے سر کو زانوں پر رکھ کر پریشانی کے عالم
میں غرق اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ راحت پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اس حالت میں
راحت اور بھی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

راشد نے پہلی بار راحت کا لمس محسوس کیا تھا۔ آج اس کی محبوبہ اس کے

روبرو بے حس و حرکت پڑی تھی۔ راشد کے دل میں کتنی آرزو تھی کہ راحت لمحہ بھر کے لئے ہی اس کے بازوؤں کے حلقے میں آجائے یا اس کی گود میں اپنا سر رکھ دے لیکن راحت نے کبھی اس کا موقع نہیں دیا۔ آج راحت کا نازک جسم اس کے قبضہ و اختیار میں تھا تو وہ کچھ نہ کر سکا۔ حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ چند منٹوں کے بعد راحت کو ہوش آیا تو وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور غصے سے بولی۔

”تم ابھی تک یہیں ہو شہری بابو! میں پھر کہتی ہوں کہ میرا پیچھا کرنے سے تمہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ ارے بابو تم رو بھی رہے ہو لیکن کیوں؟ کیا واقعی تم مجھے چاہنے لگے ہو؟ کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے، غلط ہے۔ افسوس تم اتنی دور نکل آئے۔ خدا کے لئے اب بھی واپس لوٹ جاؤ۔ شہر میں تمہیں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی ہے جو مجھ سے لاکھ درجہ بہتر ہوگی۔ میں تو دھول ہوں دھول جو پاؤں تلے روندی جاتی ہے یا فضاؤں میں بکھر جاتی ہے۔“

”راحت یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہیں اس تکلیف میں دیکھ کر کیا میں جین سے رہ سکوں گا؟ ہر گز نہیں۔ میں تمہارے بغیر جینا یا زندہ رہنا بے معنی سمجھتا ہوں۔ میری آنکھوں کی روشنی، کانوں کی سماعت اور دل کا قرار تم ہو، فقط تم۔“

راشد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ دل کا لاوا آنکھوں کی راہ سے

بھوٹ پڑا۔ اپنا اُترا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے راشد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ راحت کا دل درد سے بھر گیا وہ بولی۔

”باو! مرد ہو کر روتے ہو۔ کیا تم کسی بھی طرح مجھ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے؟ یقین کرو کہ میں اب تمہارے یا کسی اور کے لائق نہیں ہوں باو! میں اب وہ راحت نہیں رہی ہوں جس کی تمہیں جستجو ہے، چاہے۔ باو وہ راحت مرچکی ہے۔ اب اس راحت کو کوئی نہیں پاسکتا۔ تم بھی نہیں۔ تمہیں جس راحت کی تلاش ہے وہ تو روندنی جا چکی ہے۔“

”آخر کیا بات ہے کہ جس کے باعث میں تمہیں پا کر خوش نہیں رہ سکتا۔ راحت کاش تم میرے دل میں جھانک کر دیکھ سکتیں آخر کیا وجہ ہے کہ تم مجھے نہیں چاہتیں؟ بتاؤ راحت خاموش کیوں کھڑی ہو۔ میں جواب چاہتا ہوں۔ راحت تمہیں میری قسم۔“

”باو کیا کرو گے سُن کر! میری زندگی میں فقط سسکیاں اور آہیں ہیں۔ پس اتنا جان لو کہ میں ایک زندہ لاش ہوں۔“

”راحت کیا میری یہ حالت دیکھ کر بھی تمہیں میری محبت پر یقین نہیں آتا میری باتوں پر تمہیں اعتماد نہیں

راحت کچھ تو بتاؤ کہ تم اپنے آپ کو بربادی کے غار میں

دھکیل دینے پر کیوں آمادہ ہو؟ تمہیں اُس ہستی کا واسطہ جو
 تمہیں اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے
 اصلیت سے باخبر کر دو میں تمہارا غم ہاشنا چاہتا ہوں۔“
 ”بابو بس کرو۔ آگے کچھ نہ کہو بہتر یہی ہے کہ میری
 محبت کو دل سے نکال دو اور واپس چلے جاؤ۔“

دونوں جانب خاموشی چھا گئی۔ مکمل سکوت! ایک دوسرے پر نگاہیں مرکوز کرنے
 کے بجائے دونوں پاس ہی بنفشہ کے جھنڈ کو دیکھنے لگے۔ بنفشہ کے پھولوں کی مہک فضا میں
 پھیل رہی تھی۔ راشد نے غیر ارادی طور پر بنفشہ کی جھکی ڈالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مٹا
 جھاڑیوں کی اوٹ میں سے رونے کی آواز آنے لگی اور خاموش ماحول میں کھلبلی سی مچ گئی۔
 راشد کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ حیران و ششدر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

راحت جھاڑیوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر کرتی سُرعت کے ساتھ تھوٹے چنار کی
 جانب بڑھی اور ایک معصوم بچے کو گود میں لئے راشد کے مقابل کھڑی ہو گئی۔
 ”یہ دیکھو بابو! غور سے دیکھو۔ کیا اس ننھی سی جان کو دیکھنے
 پر بھی میری تمنا کرو گے۔ بتاؤ بولتے کیوں نہیں؟ تمہاری
 زبان پر تالے کیوں پڑ گئے؟“
 ”راحت یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟“

”کیوں جوش موہم پڑ گیا۔۔۔؟ محبت کا بھوت
 سر سے اتر گیا؟ مجھے اپنانے کو ٹھانی تھی وہ ولولہ کہاں گیا۔
 میں تمہاری زندگی تھی وہ جذبہ کیا ہوا؟ بابو پسینے سے بھیگ

کیوں گئے؟ میں جانتی تھی کہ اصلیت جاننے کے بعد
 تمہارا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور میرے لیے تمہارے دل
 میں نفرت جاگ اُٹھے گی۔ آخر تم بھی تو شہری بابو ہو۔
 ٹھیک اس منے کے بابو کی طرح۔ اس نے جس طرح مجھے
 برباد کیا میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ کرایہ دار کی حیثیت سے
 ہمارے گھر میں بسا تھا اور میں اس کے لئے بیٹی جیسی تھی
 لیکن اُس بد طبیعت نے میری سادہ لوحی کا اس طرح ناجائز
 فائدہ اُٹھایا کہ ایک دن۔۔۔ میں بے بس تھی کچھ کر نہ سکی
 عورت ہونا ہی بذاتِ خود ایک کمزوری ہے۔ اس نے مجھ
 سے وہ گوہر گرانما نہ چھین لیا جس کی حفاظت دل و جان
 سے کرتی آئی تھی۔ اور پھر مجھے سدا کے لئے اپنا بنانے کا
 فریب دے کر وہ اس بستی سے ایسا غائب ہوا کہ اب تک
 واپس نہیں آیا۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے بچے
 کی ماں بننے والی ہوں۔۔۔۔ بابو میں تو ماں ہوں میں
 اپنے بچے کو جان سے نہیں مار سکتی اسی لئے اس بیابان میں
 زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں صرف اس ننھی سی جان
 کے لئے، جگر کے ٹکڑے کے لئے، بہانے سے دور، بستی
 سے الگ اور اپنوں سے جدا۔ میں اس قابل نہیں کہ بستی
 والوں کے سامنے سر اونچا کر سکوں۔۔۔ مجھ میں اب

زندہ رہنے کی حسرت ناپید ہو چکی ہے۔ بابو تم چلے جاؤ،
مجھے ستانے سے تمہیں کیا ملے گا۔ میں تو اب ایک زندہ
لاش ہوں۔۔۔ اس بچے کے لئے زندہ ہوں۔ میں ممتا کا
گلا نہیں گھونٹ سکتی اور ہاں بابو! اس لٹیرے۔۔۔ خونی
بھٹیرے کی میری پاس ایک نشانی بھی ہے۔ دیکھتے جاؤ،
ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ شہر میں مل جائے۔ وہ بھی تو شہر ہی کا
تھا، تمہاری طرح۔ مل جائے تو یہ نشانی اسے واپس
کر دینا۔“

”یہ ہے اس معصوم کا باپ۔۔۔۔۔ یہ تصویر اسی کی ہے“
راحت۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ دیکھ۔۔۔۔۔ رہا۔۔۔۔۔ ہوں“
”میرے بابا۔۔۔۔۔“ اپنی ہی تصویر کا دوسرا رخ دیکھ کر راشد کے ہوش اُڑ گئے۔
چاروں طرف اندھیرا چھانے لگا۔ آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھر اگئیں
اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ راحت نے بچے کو تھوٹھے چنار میں چھوڑ کر راشد کو سہارا دینے کی
کوشش کی لیکن بے سود۔ روح نے راشد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔



جینے کا سہارا

مہینہ تمبر کا اور چودھویں کی شب۔ نیلے آکاش کی وسعتوں میں چاند پوری آب و تاب کے ساتھ ضوئیں ہو کر ساری کائنات پر نور کی چادر بچھا رہا تھا۔ خوش کن سبک خرام ہوا چاروں اور پھیل کر ٹکرانے سے درخت و جد میں آکر آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ آس پاس پُر فضا ماحول، نشہ نیند میں پور تھا۔ البتہ صفیہ شب باشی کے کمرے کے کشادہ پلنگ پر بیٹھی اپنی برگشتہ بختی ولا چاری پر ماتم کنائیں تھی۔ اُس کے بغل میں ننھا صغیر آرام سے سو رہا تھا۔ صفیہ نے بھی سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔ دالان میں آکر آرام کرسی پر دراز صفیہ دُور خلاؤں میں گھورنے لگی۔۔۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ کتنی بد قسمت ہے۔ زندگی بھر وہ راحت و مسرت کے لئے ترستی رہی۔۔۔ اس نے فرط محبت میں صغیر کو سینے کے ساتھ چسپان کر کے غیر ارادی طور پر ٹرانزسٹر کا بٹن آن کر دیا۔۔۔ ایک نسوانی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”آنسو کا ایک سمندر اور میں

میرے ارمانوں کا دفتر اور میں

طائر بے حال بے پروا اور میں

بے بسی کا ایک منظر اور میں

مشکلوں کا ایک لشکر اور میں

وقت کا نادیدہ خنجر اور میں

صفیہ کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ وہ سوچوں کی نگری میں کھونے لگی۔ ٹی پائے پر پڑی ناصر کی تصویر پر نظریں جم گئیں۔ تصویر کے خدو خال میں گھورتے ہی گئے گزرے واقعات ایک ایک کر کے تحت الشعور میں ابھرنے لگے۔ غمزہ دل میں بھرا لاوا آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہہ نکلا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماضی کی یادیں آب و تاب کے ساتھ صفیہ کے روبرو قیام کرنے لگیں۔

”تم کتنی حسین ہو صفیہ اور یہ خم دار شریر لٹیں

جیاندے مکھڑے کا خُسن دو بالا کر رہی ہیں“

ناصر نے اُس کے بالوں کی لٹخوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

”چھوڑیے۔ رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرنا

کوئی آپ سے سیکھے۔“ - صفیہ نے کہا

”سچ صفیہ تمہاری رفاقت اور وابستگی نے میری پڑمردہ

زیست میں جہاں بھر کی رعنائیاں بھر دیں ہیں۔“

صفیہ کے شیریں ہونٹوں پر ملکوتی تبسم چھا گیا اور دل فرطِ محبت میں اچھلنے لگا۔

ساتھ میں غیر ارادی طور زبان واہوئی۔

”مجھے اکثر یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں

جاؤ گے۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔

”پگلی یہ تمہارا وہم ہے۔ کوئی اپنی زندگی کی رعنائی

سے کیسے دغا کر سکتا ہے۔“ ناصر بات کاٹے گلو گیر آواز
میں کہہ گیا۔

”جانے کیوں کبھی کبھی اس اُس طرح کے خیالات
ذہن میں ابھرتے ہیں، جو مجھے پریشان کرتے ہیں۔“
صفیہ نے ناصر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”ایسی باتوں کو دل یا ذہن میں جگہ ہی کیوں دی
جائے جن کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔“

یہ کہتے ناصر نے صفیہ کے سرخ سرخ انگاروں جیسے دہکتے ہوئے گالوں پر تھکی
دیتے ہوئے کہا۔

”صفیہ تمہیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے کہ قدرت
نے ہمارے پیار کی لاج رکھی اور ہمیں سدا کے لئے
ازدواجی بندھن میں مقید کر لیا۔ اب تو زندگی کے طویل
سفر میں ہم دونوں نے ساتھ ساتھ قدم بڑھا کر مستقبل کو
درخشاں بنانا ہے“

ناصر کی پیار کی باتیں سن کر صفیہ کے لبوں پر شادمانی اور بشارت کے نقوش ظاہر
ہونے لگے۔ اس کی خوابیدہ نگاہیں جھک گئیں۔

بدلے میں ناصر نے اُسے لگے لگایا۔ پیار کے ساگر میں غوطہ زن دونوں خوشی
سے جھوم اُٹھے۔

فضاء مسکرا اٹھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری کائنات میں مسرت و انبساط کی

بہار چھانے لگی۔۔۔ ساتھ میں گئے گزرے واقعات سلسلہ وار صفیہ کے ذہن میں واضح انداز میں منڈلانے لگے۔

۔۔۔۔۔ ناصر کی صفیہ سے پہلی ملاقات ذکیہ کے یہاں ہوئی تھی۔۔۔ اُس روز موسم بہت ہی سُہانا تھا۔

”یہ ہیں میری شوخ اور شیریں نوا سہیلی صفیہ جس کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا۔ اور ہاں صفیہ یہ ہیں ڈاکٹر ناصر میاں میرے بھائی جان“

ذکیہ نے اپنائیت کے لہجے میں مختصر سا تعارف کرایا اور خود بغل والے کمرے میں چلی گئی۔

”ذکیہ سے آپ کی بابت جاننے کے بعد آپ سے ملنے کا کافی اشتیاق تھا۔ شکر ہے ذات پاک کا آج مُراد بھر آئی۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

ناصر نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔

”میں مقامی گرلز سکول میں ٹیچر ہوں“ اتنے میں ذکیہ نمودار ہوئی اور ناصر نے چاہنے کے باوجود وہاں سے چلے گئے۔

وقت گزرتا رہا۔ اور ساتھ ساتھ صفیہ اور ناصر کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی دراز ہونے لگا۔ دونوں لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی جانب بڑھنے لگے۔

”اونہہ آپ“ اسکول کے باہر ناصر کو پا کر صفیہ کھل اُٹھی۔

”جی ہاں! بیماری کی دوا لینے حاضر ہوا ہوں۔“

ناصر شرارتاً مسکرائے لگا۔

”ڈاکٹر میں نہیں شاید آپ ہیں“۔ صفیہ بھی مسکرائے گی۔

”کبھی کبھار ڈاکٹروں کو بھی دواؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔“

اسی کیساتھ ناصر دُردیدہ نگاہوں سے صفیہ کو گھورنے لگا۔ صفیہ نے نگاہوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکالیں۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ناصر نے صفیہ کا امبرین زلفوں کو انگلیوں سے الجھا دیا۔ شوخ نظریں آپس میں ٹکرائیں۔

اور پھر ”چٹ مٹگنی پٹ شادی“ کا جان فزا وقت بھی آ گیا۔ کتنی پُر لطف اور قابل رشک تھی ان کی زندگی مایوسیاں اور اداسیاں اُن کی ازدواجی زیت سے کوسوں دُور تھیں۔۔۔۔۔ لیکن اُس کردگار کو صفیہ کی یہ خوشیاں منظور نہ تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی باتوازن زندگی کے ساگر میں ارتعاش سما گیا اور نہ جانے کس بد بخت کی نظر لگ گئی کہ صفیہ و ناصر کے جیون کی کشتی منجھدار میں پھنس کے اپنا وجود کھو بیٹھی۔ گویا مسرتوں بھری زندگی صفیہ کے لئے وبال جان بن گئی۔ ناصر روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار بنے صفیہ کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوا۔ اُس کا جیون ساتھی سدا کے لئے جُدا ہو گیا۔ اُس کی زندگی کا مہکتا ہوا گلستان غم کی دھوپ سے مرجھا گیا۔ اب وہ تھی اور اُس کی چاروں جانب پھیلی بے کسی اور بے بسی۔۔۔۔۔

صفیہ سوچوں کی دنیا میں گم تھی کہ پاس میں سوئے ہوئے ننھے صغیر کے رونے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔۔۔۔۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب صفیہ تھی کمرہ شب باشی اور روتا ہوا صغیر۔ صفیہ نے ماضی کے دلدل سے نکلنے کیلئے اپنے بچے صغیر کا سہارا لینا چاہا اور وہ اُسے اپنے سینے سے چمٹا کر چُو منے لگی۔

”کیوں میرے لعل کیا چاہئے؟“

”ماں! ابودان (ابوجان) کب آئیں گے؟“

اس کے ساتھ صغیر ماں کی مُشفقانہ گود میں مچلنے لگا۔ صفیہ کے دل کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔ شدت غم سے اُس کی حالت ابتر سی ہونے لگی۔ اپنے آپ کو کسی طرح سنبھالتے ہوئے گویا ہوئی۔

”ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے“

”امی، ابودان کہاں گئے ہیں؟“

تین برس کا صغیر تو تلی زبان میں بولا اور رونے لگا۔

”وہ بہت دُور گئے ہیں بیٹا۔۔۔ بہت دُور۔۔۔“

اب تم سو جاؤ! اچھے بچے ضد نہیں کرتے“

صفیہ نے صغیر کو دلاسا دیا اور سینے سے لگائے اُسے سُلانے کی کوشش کی۔ چند ثانیوں کے بعد صغیر کو نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔۔۔ صفیہ کی بوجھل پلکیں بھی جھپکنے لگیں۔ حقیقت کی دنیا سے دُور صفیہ پھر سے خیالات کی نگری کی سیر کرنے لگی، اُسے یاد آیا کہ ایک رات اُس کا ماتھا تیز بخار سے تپ رہا تھا۔ اور دیر تک ناصر سر ہانے بیٹھے سرد پانی کی پٹیاں بدلتا رہا۔ بخار کے مارے صفیہ کی حالت خستہ لگ رہی تھی۔

”ناصر بہت دیر ہو گئی ہے اب تم سو جاؤ“ صفیہ نے درد

بھرے انداز میں التجا کی۔

”صفیہ تم کتنی نادان ہو۔ تم بے قراری کا ہدف بنی

ہو۔ اور میں آرام کروں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو کہ

”۔۔۔۔۔“

”میں کتنی بد نصیب ہوں کہ شریک حیات کے طور کسی طرح کی راحت تمہیں فراہم نہ کر سکی۔“

صفیہ نے بات کاٹتے جواب دیا۔

”صفیہ ایسا مت سوچو۔ تم میری محبوبہ ہو۔ تمہارے بغیر جینا بھی اب میرے لئے ناممکن ہے“

اس کے ساتھ ہی ناصر صفیہ کا سر گود میں لئے اُسے چومنے لگا۔ فریاد محبت میں صفیہ نے اپنے خشک ہونٹ ناصر کے پھڑکتے ہونٹوں سے چپان کر دیئے۔۔۔۔۔

اتنے میں ننھا صغیر پھر رُدا اٹھا۔ صفیہ چونک اٹھی۔ خیالات کے دھارے سمٹ گئے۔ اب صفیہ تھی اور ناصر کی امانت صغیر۔ صفیہ نے آنکھوں کے حلقے خشک کئے ایک سرد آہ بھری اور صغیر کو بانہوں میں دبوچ لیا۔

اب تو صغیر کا وجود ہی صفیہ کے جینے کا سہارا بن گیا تھا۔ اُس نے صغیر کو پالنے میں اپنا عیش و آرام داؤ پر لگا دیا ہے۔



گرگٹ صفت

پست طبقوں سے وابستہ افراد خاص کر بیواؤں اور نادار خواتین کی جانب دست تعاون دراز کرنے کی غرض سے ریاستی سرکار نے محکمہ سوشل ویلفیئر اور صنعت و حرفت کے اشتراک سے وادی کے اکثر ضلعوں میں تربیتی سینٹر چالو کر دیئے ہیں۔ جن میں سلائی، بنائی اور دیگر چھوٹی صنعتوں سے متعلق جانکاری فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ماہ بہ ماہ کچھ رقم بطور آمد بھی فراہم کر دی جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک مقامی تربیتی سینٹر کی جانب جہاں آرا کے قدم بڑھنے لگے۔

وہ جہاں آرا کھاتے پیتے گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ لیکن گردشِ دوراں کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہوا یوں کہ ایک شام جبکہ جہاں آرا، ماں اور چھوٹے بھائی پرویز کے ہمراہ دُور درشن (میٹرو چینل) کے دلچسپ پروگرام دیکھنے میں محو تھی اچانک ایک دلدوز خبر سننے کو ملی بانی پاس چوک میں سیکورٹی بکر کے قریب نامعلوم افراد نے دستی بم پھینکا جس سے کچھ راہ گیر اور ایک فوجی جوان بُری طرح زخمی ہو گئے۔ بد قسمتی سے زخموں میں جہاں آرا کے والد آفتاب احمد بھی شامل تھے۔ آفتاب احمد کو دیگر زخموں کے ساتھ صدر اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ان کی حالت ابتر تھی۔ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔ دستیاب رقم سے کچھ یونٹ خون کے حاصل کئے گئے جو بے سدھ جسم میں داخل کئے گئے۔ ہر طرح کے اقدام اٹھانے

کے باوجود حالت میں بہتری کے آثار نمایاں نہ ہو سکے۔

آپریشن کی ضرورت پڑ گئی۔ شریک زندگی کو بچانے کی خاطر جہاں آرا کی ماں نے جمع شدہ پونجی اور زیورات تک داؤ پر لگا دیئے لیکن حالت میں کسی طرح کا سدھار دیکھنے کو نہ ملا۔ دراصل بائیں پسلی اور سر کے پچھلے حصے میں گہرے زخم آئے تھے۔ کچھ ہفتے موت و حیات کی جدوجہد کے درمیان آفتاب احمد اپنی شریک حیات، جہاں آراء اور پرویز کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ بھی گھر کے مکینوں کو کنگال کر کے۔

جہاں آراء کی ماں یہ جاننا صدمہ برداشت نہ کر پائی۔ غم و اندوہ کی تصویر بنی وہ اندر ہی اندر برف کی سل کی طرح پگھلتی رہی۔ تب دق جیسے مہلک عارضہ نے اسے اپنے چنگل میں لے لیا۔ لمبا چوڑا خرچہ برداشت کرنے کی پاداش میں کوٹھی تک فروخت کرنی پڑی۔ جہاں آراء کا کالج جانا بھی چھوٹ گیا۔ اب وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگے۔۔۔۔۔ جو بھی اثاثہ از قسم نقدی اور جنس بچا تھا، ماں کا علاج کرانے میں صرف ہوا۔ لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک شام جبکہ موسم میں ارتعاش سا گیا تھا۔ بادل گرج رہے تھے اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں جہاں آراء چھوٹے بھائی کے ہمراہ ماں کے سرہانے بیٹھی اپنی تقدیر کو کوس رہی تھی کہ ماں کی دم شکستہ آواز گونجنے لگی۔

”بیٹی جہاں آراء۔۔۔۔۔ کیا سوچا تھا۔۔۔۔۔ پر کیا

ہو گیا۔۔۔۔۔ انسان۔۔۔۔۔ خیالات کے تانے بانے بنتا

رہتا ہے۔ میں یہ کروں گا۔۔۔ وہ کروں گا۔۔۔ البتہ ہوتا

۔۔۔ وہی ہے جو پروردگار۔۔۔ کو منظور ہوتا ہے تمہارے

اباکی۔۔۔ خواہش تھی کہ پڑھا لکھا کر۔۔۔ تمہیں
 ڈاکٹر بنائیں اور پرویز کو انجینئر۔۔۔ سب خواب۔۔۔
 ادھورے رہ گئے۔۔۔ بیٹی التجا ہے کہ پرویز کا۔۔۔ خیال
 رکھیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ تمہیں حوصلہ۔۔۔۔۔“

اتنا کہہ کے دیکھتے ہی دیکھتے ماں کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی
 آنکھوں سے بیٹا بیٹی کو دیکھنے لگی۔ حالات میں سرا سمگی سامنے لگی۔۔۔ اسی کشمکش میں
 اسکی روح قفسِ غصری سے پرواز کر گئی۔

گزر بسر کرنے اور بھائی کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کی غرض سے جہاں
 آراء نے پیپر ماشی اور سوزن کاری کے سینٹر میں داخلہ حاصل کیا۔۔۔ بہت جلد اس نے
 متعلقہ فن میں مہارت کا مظاہرہ کیا۔ ذہانت اور دانشمندی کے علاوہ خدائے برحق نے
 جہاں آراء کو بے مثل حسن سے بھی نوازا تھا۔۔۔ سینٹر میں جس شخص کے ساتھ سب سے
 پہلے رابطہ قائم ہوا وہ تھے اشفاق جوڑینگ فراہم کرنے پر معمور تھے۔۔۔ اشفاق کی
 شرافت اور سادگی سارے سینٹر میں مشہور تھی۔ غیر ارادی طور وہ جہاں آراء میں دلچسپی لینے
 لگے۔۔۔ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگے لیکن شریف النفس ہونے کے باعث کھل کر
 جہاں آراء سے بات نہ کر پائے۔ اشفاق نے بارہا چاہا کہ جہاں آراء کو اپنے بے لوث
 محبت کا یقین دلائیں لیکن لاکھ کوشش کرنے پر بھی زبان واد نہ کر سکے۔ وقت کا پرندہ پرواز
 کرتا گیا۔

ایک روز محکمہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر ریاض الدین یونٹ کا معائنہ کرنے آئے۔
 جہاں آراء کا سامنا کیا ہوا کہ ریاض الدین کی حالت میں تغیر سما گیا۔ وہ اسے برابر دزدیدہ

نگاہوں سے گھورنے لگے۔ سادہ اور دلکش حسن کا نظارہ کئے ریاض الدین کے ذہن میں
 ہوس پرستی کا جذبہ منڈلانے لگا۔۔۔۔۔ اس کے بعد کسی نہ کسی بہانے ریاض الدین
 متذکرہ سینٹر کے چکر لگانے لگے۔۔۔۔۔ اور جہاں آراء کی مجبوریوں کی بابت جانکاری
 حاصل کی۔ اس کی جانب بظاہر ہمدردانہ رویہ اپنانے لگے۔۔۔ ایک دن خلاف توقع
 ریاض الدین صبح سویرے جہاں آراء کے کوارٹر پر حاضر ہوئے۔ چرب زبانی سے کام لئے
 پرویز کی پڑھائی وغیرہ کی بابت باتیں کرنے لگے۔ الغرض باتوں باتوں میں اس نے
 جہاں آراء کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتا ہے اور شریک
 حیات کی حیثیت سے اسے اپنانے کی چاہ رکھتا ہے۔ پہلے پہل جہاں آراء نے احتیاط کی
 راہ پر گامزن اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی البتہ ریاض الدین پختہ عمر کے
 چالپوس شخص تھے۔ طرح طرح کے حربے اپنا کے جہاں آراء کو یہ یقین دلانے میں کامیاب
 ہو گئے کہ وہ اس کے بغیر زندگی گزارنا گناہ سمجھتا ہے۔ الغرض ریاض الدین جہاں آراء کو
 ہوس پرستی کے شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔۔۔ جہاں آراء نے بھی محبت کا
 جواب اُلفت سے دینا شروع کیا۔ سینٹر میں کام کرنے والے زن و مرد خصوصاً اشفاق کو
 جہاں آراء اور ریاض الدین کا میل ملاپ اچھا نہیں لگا لیکن وہ کچھ نہ کر پائے کیونکہ وہ
 ریاض الدین کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے مجبوراً پُپ سادھے سب کچھ
 برداشت کرنے لگے۔

ریاض الدین کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر جہاں آراء بھی اس کی بابت زیادہ
 سے زیادہ سوچنے لگی۔ سیرسپائے کی غرض سے اس کے ساتھ جانے لگی۔ ایک روز پہلا گام
 سینٹر کا معائنہ کرنے کا پروگرام ریاض الدین نے مرتب کیا اور باتوں باتوں میں جہاں

آراء کو ساتھ چلنے پر آمادہ کیا۔ اچانک موسم کی خرابی کے باعث حسب پروگرام واپس نہ آ سکے اور رات وہیں گیٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں گذارنی پڑی اور اسی رات جہاں آراء نے نہ چاہنے کے باوجود گوہر گرانما نہ کو کھودیا جس کی حفاظت وہ اب تک دل و جان سے کرتی آئی تھی۔ ریاض الدین کے جال میں پھنس کر وہ اسے اپنی کشتی حیات کا ناخدا گردانے لگی۔ دونوں کا میل ملاپ بڑھنے لگا اور سینئر کے اندر وہ باہر جانکار افراد اس اُس طرح کی باتیں کرنے لگے۔ پرویز بھی بہن کی اس حرکت پر ناخوش تھا۔ جہاں آراء کو اپنی نادانی اور فاش غلطی کا احساس بھی تب ہوا۔ جب بہت دیر ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ وہ ریاض الدین کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔۔۔۔۔ ریاض الدین پر اصلیت ظاہر کیا کر دی کہ اس چاپلوس شخص کا وطیرہ ہی بدل گیا۔ گرگٹ کی صورت رنگ بدلے جہاں آراء کو آوارہ اور بد چلن کا خطاب بخشے دامن بچانے لگا۔

جہاں آراء کو ایسے لگا کہ کسی نے اس کے وجود کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا ہو۔۔۔۔۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگی۔ پریشانی اور افراتفری کے عالم میں اس نے علی الصباح بڑی ندی کا رخ کیا۔ وہ ندی میں کودنے والی تھی کہ کسی نے اس کے کان دھے پر ہاتھ رکھا۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے اشفاق تھا۔

”اشفاق مجھے مرنے دو۔ میں زندہ رہنے کے قابل نہیں“

”نہیں جہاں آراء یقین کر لو میں تمہیں دل و جان

سے چاہتا ہوں“۔ یہ اشفاق تھا۔

”اصلیت جاننے کے بعد بھی کہ میں ماں بننے والی

ہوں“ جہاں آراء مری مری آواز میں کہہ سکی۔

”ہاں! یہ اصلیت جان کے بھی“ اشفاق بلا تامل کہہ گیا۔

”محبت جہاں آراء پاک جذبے کا نام ہے جس کا تعلق روح و دل سے ہوا کرتا

ہے نہ کہ جسم سے! یقین کر لو تم ہی پہلی و آخری لڑکی ہو جسے میں نے چاہا ہے۔“

دونوں ایک دوسرے کو اُلفت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اپنائیت کے

ماحول میں جہاں آراء کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور اشفاق نے فرط محبت میں اسے
گلے لگالیا۔ نہ جد اہونے کے لئے۔



رنج سے خُگر

راحت سرکاری ہسپتال میں بطور نرس کام کر رہی ہے۔ قبول صورت، متوازن خدو خال، ہنس مکھ، شیریں زبان اور خلوص کی دولت سے مالا مال راحت کو اپنے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ ہمدردانہ اور مُشفقانہ برتاؤ اپنانے کے باعث وہ ڈاکٹروں، طبی عملہ، مریضوں اور تیمارداروں میں ہر دل عزیز بن چکی ہے۔ دن ہو یا رات شہد کی مکھی کی طرح لگن کے ساتھ اپنی ڈیوٹی بجالانا راحت کا معمول بن چکا ہے۔ سستانے یا آرام کرنے کی بابت سوچنا بھی اُسے منظور نہیں۔ شوخی راحت کی فطرت میں شامل تھی۔

یہ بھی نہیں کہ راحت کی زندگی میں فقط مسرت و شادمانی نے بسیرا کر لیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کی ذاتی زندگی مصائب و کرب کے تھپڑوں سے دوچار رہی ہے۔ اُسے بھی اس بے وفا سنسار نے خون کے گھونٹ پینے پر مجبور کیا ہے۔۔۔۔۔ دراصل راحت نے اپنی چھوٹی سی نگری میں بناشت کا رنگ بھرنے کی چاہ میں اشتیاق کے پیار کا جواب محبت سے دیا تھا۔ اپنوں کی مخالفت اور جان پہچان والوں کی ناراضگی کے باوجود اُس نے اشتیاق کو رفیقِ زندگی کے طور پر چن لیا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے اور والدین کی آپسی ناچاقی کے باعث اشتیاق لڑکپن سے ہی لا اُبالی پن کا ہدف بنے آوارگی کی راہ اختیار کر گیا تھا۔۔۔۔۔ بیٹے کا باپ بن جانے کے بعد بھی اشتیاق کی کج روی اور بے مروتی جاری رہی۔ الغرض شریکِ حیات کے ساتھ ساتھ والدین کا دل دُکھانے میں پیش پیش رہا۔ لاکھ

سمجھانے کے بعد بھی اُس کے عیاشانہ طور طریق میں کسی طرح کی تفاوت دیکھنے کو نہ ملی۔
 راحت پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب سُننے کو ملا کہ اشتیاق نے فرزانہ نام کی
 دوشیزہ سے کورٹ میرج رچائی ہے۔

راحت کی رگِ حمیت جاگ اٹھی۔ لڑکے کو اپنے قریب رکھنے اور زندگی کو آنے
 والے سیلاب سے بچانے کی خاطر کورٹ کی وساطت خُلع کی راہ اپنائے اشتیاق سے
 چھٹکارا حاصل کر لیا۔ تب سے راحت ہسپتال کے کوارٹر میں بیٹے کے ساتھ قیام پذیر ہے۔
 اُس کے دل میں غموں کا سمندر مٹھپا ہوا ہے لیکن کیا مجال اُس نے کسی کے سامنے اپنی کرب
 ناک روئیداد کا اظہار کیا ہو۔

کل رات جموں سے سرینگر آئے سیاحوں سے بھری گاڑی کا بانہال کے پاس
 حادثہ پیش آیا۔ زخمیوں کو ہسپتال منتقل کیا گیا۔ اُن میں بنگلور کے مسعود انور بھی تھے۔۔۔
 بے حس۔۔۔ اور بے حواس۔۔۔۔۔

ڈاکٹر محمود کی سرکردگی میں ایک ٹیم نے مسعود کا بغور ملاحظہ کیا اور اس نتیجے پر
 پہونچے کہ مسعود کی احساس و جذباتی قوت نیم مردہ پڑ چکی ہے۔ ڈاکٹر محمود نے اتنا تک بتا
 دیا کہ اگر جلد سے جلد اُس کے احساسات کو نہ جگایا گیا تو عین ممکن ہے کہ وہ زندگی سے
 ہاتھ دھو بیٹھے یا پاگل پن کا شکار بن جائے۔

مسعود انور کو اسپتال کمرہ نمبر ۷ میں رکھا گیا۔ اور جذبات و احساسات میں جان
 بھرنے کی خاطر خاص طور سے راحت کا انتخاب کیا گیا۔۔۔ راحت کمرہ میں داخل ہو گئی تو
 مسعود بیڈ پر آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ اُس کا گورا گورا سا مردانہ مکھڑا کھلا کھلا سا لگ
 رہا تھا۔ ڈاکٹر محمود سے تفصیل دریافت کرنے اور کیس فائل کا جائزہ لینے کے بعد راحت پر

یہ اصلیت واضح ہوگئی کہ مسعود کو حادثہ میں بائیں کندھے اور کن پٹی میں گہرے زخم آئے ہیں۔۔۔ ڈرسنگ یا انجکشن کرنے کے دوران اُسے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ ٹیسٹ کرانے کی غرض سے زخم کے ارد گرد کچھ گوشت کاٹ لیا گیا اور وہ بلا کسی حرکت کے پڑا رہا۔

گویا جذبات و احساسات کو حرکت میں لانے کی ذمہ داری راحت کو سونپ دی گئی۔ اور راحت حسب ہدایت ٹیم ٹام کی حالت میں دن رات کا بیشتر حصہ کمرہ نمبر ۷ میں گزارنے لگی۔

منہ ہاتھ دھلاتی، بٹھاتی، لٹاتی، کپڑے تبدیل کراتی اور رفع حاجت میں ساتھ دیتی۔ تصویروں کے البم دکھاتی اور کہانیاں سناتیں۔

ہفتہ بھر گزرنے کے بعد مسعود نے لبوں اور ہاتھوں کو جنبش دی۔ ایک دن راحت گلاس میں مسعود کے لئے دودھ لیکر گئی۔

”دودھ پی لیجئے“ راحت نے اُلفت بھرا انداز اپنایا۔

مسعود نے نظریں گھمائیں اور گلاس تھامنے کی غرض سے دایاں ہاتھ آہستہ سے

آگے بڑھایا۔ راحت نے اپنائیت میں اس کے ہاتھ کو تھاما۔

مسعود حیرانی کے عالم میں غرق راحت کو گھورتا رہا۔

”آپ نے کچھ محسوس کیا“۔ راحت نے پوچھا۔

”کیا“۔۔۔ یہ مسعود تھا۔

”میری انگلیوں کی لمس“

ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔

راحت بشارت کے مارے ڈاکٹر محمود کو اصلیت سے کیا آگاہ کر گئی کہ وہ مارے
خوشی کے اُچھل پڑے۔

”مجھے ناز ہے تم پر بیٹی“

ڈاکٹر کے یہ الفاظ سُن کر راحت کی خوشی دوچند ہو گئی۔

اس عالم میں کچھ دن اور گزرے

”لائے آج میں خود گلاس تھام لوں گا“۔ مسعود نے کہا

گلاس ہاتھ میں لئے وہ لیوں تک لے گیا

ہاتھ کا پنے لگا تو راحت نے سہارا دیا۔

”مجھے آپ کے ہاتھ کا ملائم پن محسوس ہو رہا ہے“

”راحت نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”نہیں!“ مسعود نے راحت کا ہاتھ زور سے دبانا شروع کیا۔

”آج آپ کے ٹمبل جیسے ہاتھ کی گرمی محسوس کر رہا ہوں،

آپ کے ایثار کو میں فراموش نہ کر پاؤں گا۔“

اگلی صبح راحت کمرے میں داخل ہو گئی تو مسعود کو اپنے انتظار میں پایا۔

دوائی پلائی۔۔۔۔۔ انجکشن کیا اور منہ ہاتھ دھلایا۔

”اب تو تمہارے چھونے سے لگتا ہے میرے تن من میں

برقی رودوڑ رہی ہو۔۔۔ تم کتنی اچھی ہو میں بیان نہیں

کر سکتا۔“

مسعود کی پیار بھری باتیں سُن کر راحت کا دل زور سے دھڑکنے لگا، وہ مسعود کو

چاہنے لگی۔

مسعود بھی اب برملا راحت کے تعریفوں کے پل باندھنے لگا۔
راحت کو ارڈر میں آکر نہادھو کر کپڑے بدلنے لگی اور پھر قد آدم شیشے کے سامنے
اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ وہ مسعود کی بابت زیادہ سے زیادہ دھیان دینے لگی۔
اگلے روز بن سنور کر ہسپتال کا رخ کیا تو خلاف توقع مسعود کو احاطے میں کھڑا
پایا۔ ڈاکٹر محمود وغیرہ بھی وہاں کھڑے تھے۔ اتنے میں مسعود کی نظر راحت پر پڑ گئی۔
”ہیلو سسٹر راحت! میرے گھر والے کل رات دیر گئے
آگئے تھے۔ میری بیوی اور والدہ مجھے لینے آئی
ہیں۔۔۔۔۔ ہاں تو سلمہ یہ ہے راحت جن کا ذکر میں
نے تم لوگوں سے کیا تھا۔ انہوں نے بڑی لگن اور ہمدردی
کے ساتھ میری خدمت بجالائی ہے میں اُن کے احسان کا
بدلہ چکا نہیں سکتا۔“

یہ کہہ کر مسعود گاڑی میں بیٹھ گیا اور راحت کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُس کے وجود
کو زہریلے ناگوں نے جگہ جگہ ڈس لیا ہو۔ ہسپتال کے بجائے کو ارڈر کا رخ کر گئی اور
اضطرابی کیفیت میں اپنی برگشتہ سختی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



جانکاہ صدمہ

اشرف اور جوگیندر شہر کے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے گہرے دوست اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے والے ہیں۔ دونوں متمول گھرانوں کے تعلقات برسوں پر محیط ہیں۔۔۔۔۔ اشرف کے دادا سیٹھ سلیمان شاہ اور جوگیندر کے دادا سردار پرجمیت سنگھ دونوں فارسٹر کے طور کام کرتے تھے۔ اُن کے بعد اشرف کے والد سیٹھ جمال شاہ اور جوگیندر سنگھ کے پتا سردار کرتار سنگھ نے دوستی کو قائم رکھتے ہوئے ٹھیکہ داری کے پیشے کو اپنایا۔ دونوں گھرانوں کے اپنائیت و پریم سے لبریز ماحول کے شہر بھر میں چرچے تھے۔۔۔ آج کل اشرف قالین کا بیوپار کر رہا ہے اور جوگیندر نے فرنیچر تیار کرنے کا کارخانہ کھول رکھا ہے۔

اشرف اور جوگیندر ماں باپ کی اکلوتی اولاد زینہ ہونے کے باعث ناز و نعم میں پلے، پڑھائی کی جانب زیادہ دھیان نہ دے کر لا اُبالی پن کا ہدف بنے ناتراشے قلم کی صورت ہر طرح کی قباحت کو اپناتے رہے۔ اشرف کی بہن ذکیہ اور جوگیندر کی بہن رانو بھی بھائیوں کے نقش قدم پر چل کر ایک دوسرے کی دانت کافی روٹی کھا لیتے۔ ایک ہی کالج میں زیر تعلیم تھیں اور دونوں میں گہری دوستی تھی۔

اشرف اور جوگیندر دونوں جہلتا حسن پرست ہیں۔ ہر خوبصورت چیز سے اُنکا لگاؤ

رہا۔ اپنے ذاتی کمروں کو انہوں نے ایک سے ایک خوبصورت پینٹنگ، مورتی یا جانوروں کی تصویروں سے سجا رکھا ہے۔ اسی طرح خوبصورت اور حسین لڑکیوں سے رابطہ قائم کر کے اُن کے جذبات سے کھلواڑ کرنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ بے حساب دولت کے ہوتے ہوئے شراب پینا، جو اکیلنا، کلب جانا اور آزاد طبیعتی کا مظاہرہ کرنا اُن کا معمول بن چکا ہے۔

اشرف نے نئے تعمیر شدہ گل لالہ باغ کی بابت سنا تھا۔ جائے مخصوص پر جو گیندر کو نہ پا کر کٹ لیکر وہ باغ کے اندر چلا گیا۔ مہین کپڑوں میں ملبوس دوشیزہ کو دیکھے عادت سے مجبور فقرہ گسا:

”سنائے: کیا لوگی رات کا“

دوشیزہ نے گھبراتے ہوئے اپنے سینے کو برائے نام ڈوپٹے سے ڈھانپا اور نفرت آمیز نگاہوں سے اشرف کو گھورتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ لیکن اشرف سے بچ پانا محال۔ بے شرمیوں کی طرح لپک کر دوشیزہ کے مقابل قدم ملائے چلنے لگا۔ ابھی کچھ دور ہی چلا تھا کہ جو گیندر کی آواز نے چونکا دیا۔

”ارے اشرف: کیا معاملہ ہے بھائی“

سامنے فٹ پاتھ پر جو گیندر کھڑا تھا۔

اشرف نے دوشیزہ کا تعاقب کرنا چھوڑ دیا۔

”کیوں جگو: تم وقت پر نہیں آئے، خیریت ہے“

”ارے یار پاپاجی نے پکڑ لیا تھا۔ رانو کی شادی کی بات

چلی تھی۔ ایک مناسب گھرانے سے رشتہ آیا ہے۔“

دونوں تقریباً ہر شام! کھٹے سیر کو نکلتے، کبھی گگری بل، نہرو پارک، چار چناری، اقبال پارک یا پھر نمائش اور آتی جاتی قبول صورت لڑکیوں پر اس اُس طرح کے فقرے کسنا۔۔۔ بھنورے کی طرح مختلف قسم کے پھولوں کا رس پوسنا ان کا دین و ایمان تھا۔

”ارے آج کی بابت کیا سوچا ہے؟“ اشرف نے لقمہ دیا۔

”آج کا پروگرام نہایت ہی دل چسپ ہے“ یہ جو گیندر تھا۔

گاڑی میں بیٹھ ننگین باغ کی طرف چل پڑے اور ”کاینات“ نام کے بڑے عالیشان ہاؤس بوٹ میں داخل ہو گئے۔ ایک موٹی سی نیم عریاں خاتون نے استقبال کیا۔

”یہ دل نشین ہے“ جو گیندر نے تعارف کرایا۔

”اندر کیمن میں دل نشین کی چھوٹی بہن دل آرا تمہارے

انتظار میں ہے۔ اس بازار میں نئی ہے جاؤ مزے لوٹو“

شراب کے دوپگ حلق پر انڈیلنے کے بعد اشرف کیسبن کے اندر گیا۔ دل آرا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سامنے سجے سجائے پلنگ پر بیٹھی تھی۔۔۔ بلا کی حسین۔۔۔ اشرف نے سراپا کا جائزہ لیا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں آپ“ دل آرانے پوچھا

”دیکھتا ہوں تم حوازا دی ہو یا پری ذات۔۔۔ توبہ!

اس قدر خوبصورت۔۔ نظر نہیں ٹھہرتی۔

”چھوڑے۔۔۔ بنائے مت“

اشرف نے حسن کی تاب نہ لا کر کوٹ نکالا اور دل آرا کی طرف بڑھنے لگا۔ اتنے میں بغل والے ہاؤس بوٹ کے کیبن سے ہنسی کا فوارا پھوٹ پڑا۔ ساتھ ہی ایک مانوس

آواز نے اشرف کی سماعت کے پردے ہلا کر رکھ دیئے۔۔۔۔۔ سرگوشیاں ابھریں۔
 اشرف کے تحت الشعور میں عجیب طرح کی ہلچل مچ گئی۔ اُس کا سارا نشہ کافور
 ہوا۔

نیم عریاں دل آرا سے آنکھیں پُجرائے کوٹ پہن لیا۔ بڑھ نکال کے دل آرا کے
 پلنگ پر چھوڑا دس بوٹ سے باہر آیا۔
 ”اُنکھیاں موبائل پر تھرکنے لگیں
 ”ماں ذرا ذکیہ کو دینا“

”وہ رانوں کے گھر گئی ہے دیر سے لوٹے گی“
 ”اچھا ماں! میں فارم ہاؤس میں رات گزاروں گا، فکر نہ کرنا۔۔۔“
 دل آرا ڈھنگ کے کپڑے، پہنے باہر آگئی لیکن اشرف چلا گیا تھا۔ وہ دیدی کی
 کیبن میں گئی جہاں جوگیندر کی آغوش میں وہ جذبات کی دنیا میں غرق تھی۔
 ”دیدی وہ چلا گیا۔ اُس نے مجھے چھوا تک نہیں۔ اور
 روپیوں سے بھرا بڑھ بھی چھوڑ گیا۔“

یہ سُنا تھا کہ جوگیندر کا سارا نشہ اُتر گیا۔ وہ حیران کہ اس قدر حسین لڑکی کو کیسے
 اشرف نے صبح سلامت چھوڑ دیا۔

جوگیندر مخصوص جگہوں پر اشرف کو ڈھونڈنے گیا۔ ہوٹل، کلب کہیں نہیں تھا۔
 پریشانی کے عالم میں اشرف کے گھر فون کیا تو ماں جی نے بتایا کہ فارم ہاؤس چلا گیا ہے۔
 رات کاٹ کے جوگیندر صبح سویرے سیدھے فارم ہاؤس چلا گیا۔ چونکہ اربست پال نے بتایا
 کہ ”چھوٹے سرکار رات دیر گئے آگئے۔۔۔۔۔ کچھ کھایا یا نہیں۔۔۔ اور سو گئے۔ ابھی تک

نہیں اُٹھے۔“

جب کھٹکھٹانے سے دروازہ نہ کھلا تو جوگیندر نے ست پال کی مدد سے دروازہ
توڑ دیا۔

اشرف اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ جوگیندر نے اُنھانے کی سعی کی لیکن روح
نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

افسوس حوازا دیوں کی عزت و ناموس کی چادروں کو تار تار کرنے والا عیاش
فطرت اپنے گھرانے کی دہلیز پر سلگتی چنگاری کی تپش تک برداشت نہ کر سکا۔

☆☆☆

اعتبار

کا جل حد درجہ اُداس اور افسردہ ہے۔

اُسے غم و کرب نے مکمل طور اپنے چنگل میں لے رکھا ہے۔ کہاں بات بات پر مذاق کرنے والی اور سدا مُسکرا نے والی کا جل اور کہاں پہ آج کی پڑمردہ کلی۔۔۔ اُسے کسی طرح کا قرار حاصل نہیں۔۔۔ اور پھر غم غلط کرنے کی نیت سے اُس نے مستی بھری بوتل کا سہارا لیا۔ شراب کی کچھ مقدار حلق کے اندر کیا گئی کہ کا جل کی ہستی ڈگر گانے لگی۔ اُس کے ذہن میں افراتفری سے لبریز سوتے پھوٹنے لگے۔ گئی گزری یادیں اُبھر کر اُسے بے قرار کرنے لگیں۔۔۔ کا جل آرام کرسی پر براجمان سامنے تپائی پر پڑے ”پیر ویٹ“ کو انگلیوں سے گھمانے لگی۔ کانچ کے ”پیر ویٹ“ پر بنی کچھ جانوروں کی تصویریں گھمانے سے ایک دوسرے سے غلط ملط ہو گئیں۔۔۔ ساتھ ہی کا جل کے روبرو ماضی کے واقعات ایک ایک کر کے منڈلانے لگے۔

کا جل سوچنے لگی، نہ جانے دلیپ کہاں ہوگا۔۔۔ وہ زندہ بھی ہے یا۔۔۔ اُف! کیوں میں نے دلیپ کا دل توڑا۔۔۔ اُس کے ارمانوں کا خون کر دیا۔۔۔ میں نے اُس کے پیار کو خاطر میں نہ لائے اچھا نہیں کیا۔۔۔ آخر کیوں میں نے اُس کی چاہت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔۔۔ اب میری زندگی ایک عذابِ مسلسل سے کم نہیں!

دراصل کا جل زندگی میں دھوکے پر دھوکہ کھا گئی تھی۔ اس لئے دل کے ہاتھوں
مجبور ہو کر دیپ کی بے لوث اُلفت کو خاطر میں نہ لاسکی۔ محبت کی آڑ میں اُس نے اس قدر
چوٹیں کھائی تھیں کہ مرد ذات سے ہی اُسے نفرت ہو گئی تھی۔ اُسے سارے مرد دھوکہ باز،
فریبی اور دغا باز جان پڑتے تھے۔ وہ کسی ایک پر اعتبار نہیں کر پاتی۔

کا جل نے جس کے آگے دست شفقت دراز کیا اُسی نے حیوانیت کی راہ پر
گامزن اُس کے ارمانوں سے کھیلنا اپنا فرض جان لیا۔۔۔۔۔ ہوس پرستی کے دلدادہ اکثر
مردوں نے اُسے اپنائیت و ہمدردی کے نام پر ضلالت کی آغوش میں دے پھینکا۔

کا جل ایک شریف، خاندانی اور تہذیب یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔
کورے اور سفید کاغذ کی طرح اُس کی چڑھتی جوانی بے داغ تھی۔ ناگہانی حوادث میں ماں
باپ کا ساتھ چھوٹنے کے بعد کا جل کی ہستی ایک ڈور کٹی پتنگ کی سی تھی۔ جو بے ارادہ ادھر
اُدھر بھٹکتی رہتی۔۔۔۔۔ کسی ایک نے اُس کی دست گیری نہیں کی۔۔۔۔۔ بلکہ زمانے کے
تھیٹرے کھائے کا جل نے شرافت کی نگری کو خیر باد کہا۔۔۔۔۔ اور پھر رُوح و دل کی
چاہتوں کے برعکس ہوس پرست مردوں نے اُسے ذلیل پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

۔۔۔۔۔ راکیش ایک نڈر اور بے باک جوان تھا۔ وہ کا جل کی زندگی میں طوفان

کی طرح داخل ہوا۔

”کا جل! میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ یقین

کر لو میں نے تم سے پہلے کسی ایک لڑکی طرف آنکھ اٹھا کر

بھی نہیں دیکھا ہے۔ تم پہلی لڑکی ہو جس کے لئے میرے

دل میں محبت کی کلی پھوٹ پڑی ہے۔ میرا خیال ہے

تمہیں بھگوان نے میری خاطر اس دنیا میں بھیجا ہے۔“

”جذبات میں بہہ کر بے سر پیر کی باتیں نہ کرو۔“

حالات کا بھرپور جائزہ لو اور گھر والوں کو اعتماد میں لو۔“

کاجل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ لیکن ایک تجربہ کار شکاری کی طرح راکیش نے سبز باغ دکھائے کاجل کو اپنے دام فریب میں پھانس دیا۔ آہستہ آہستہ راکیش کی چکنی چیڑی باتوں میں آکر کاجل بھی اُسے ٹوٹ کر چاہنے لگی۔ غرض دونوں ازدواجی رشتے میں بندھ گئے۔

جلد ہی کاجل پر یہ اصلیت واضح ہو کر رہ گئی کہ راکیش ایک امیر گھرانے کا بگڑا شہزادہ ہے لاابالی پن کا دلدادہ۔۔۔ وہ جان گئی کہ راکیش ایک بھنورا ہے۔ ایک پھول کا رس بھوس کے دوسرے مٹھول کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کاجل کو یہ احساس ہوا مگر بہت دیر کے بعد جبکہ وہ پوری طرح لٹ چکی تھی۔ وہ جس بوجھ کو کوکھ میں لئے پھر رہی تھی راکیش کی دغا بازی کے بعد کسی آشنا نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس لمبی چوڑی دنیا میں تنہا رہ گئی۔

اُس کا کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔

کوئی درد بانٹنے والا نہیں تھا۔

غرض محبت کے بدلے اُسے خون کے گھونٹ پینے پڑے۔

اسی بے بسی و بے کسی کے عالم میں کاجل کی زندگی میں ایک اور بھنورا دیپ کے

نام سے نمودار ہوا۔

”میں رُوح کی گہرائیوں سے کاجل تمہیں چاہتا ہوں۔“

کاش تمہیں میری پاکیزہ، بے لوث اور پُر خلوص محبت پر یقین آتا۔۔۔“
 کا جل کو ایسا لگا کہ جیسے پچھلے دنوں نے اُسے جگہ جگہ کاٹ کھایا ہو۔ غضب ناک لہجہ
 میں لاکاری:

”پیار اور محبت تو مردوں کے لئے ایک مشغلہ سے کم
 نہیں۔ چاہت کی آڑ میں تم لوگ دراصل ہوس پرستی کی
 دیوی کی پوجا کرتے رہتے ہو۔ طرح طرح کے حربے
 اپنائے مرد لوگ عورتوں کو چاہنے لگتے ہیں اور پھر اُن کے
 جذبات و احساسات سے کھیلے اپنے سے یوں الگ
 کر دیتے ہیں جیسے مکھن سے بال۔“

”کا جل مجھ پر بھروسہ کرو، میں اُن مردوں میں نہیں
 جو خواتین کو عیش و عشرت کا کھلونا تصور کئے اُن کی ناموس
 کا سودا کرتے ہیں۔“

”یقین کر لوں: وہ بھی ایک مرد پر۔۔۔۔۔ یقین کر لو
 کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو۔ ایک بات کا جواب
 دو گے دلیپ“

”کون سی بات“

”تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو، یعنی تمہاری
 نگاہوں میں میری حیثیت کیا ہے“ یہ کا جل تھی۔
 ”تم میری نگاہوں میں بہت ہی عظیم ہستی ہو کا جل۔“

تم دیوی کے سامان ہو۔۔۔ اور یہ بھی سچ کہ میں تیرے بغیر
زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔ تم۔۔۔

”ہاہاہا“۔۔۔ کا جل بات کاٹتے بولی

”تم بھی مجھے بے وقوف بنانے لگے ہو۔۔۔ سب
مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ راکیش نے بھی میری تعریف
میں یہی الفاظ دھرائے تھے۔ سب مرد ایک جیسے ہوتے
ہیں۔ آستین کے سانپ“

اب کے دلپ گلوگیر آواز میں برجستہ کہہ گیا۔

”میں پاگل ہوں یا دیوانہ جو تمہیں میری باتوں پر
یقین نہیں آتا۔ تم راکیش کی طرح مجھے بھی بے وفا اور دغا
باز خیال کرتی ہو۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں،
کا جل مجھے بے موت مت مارو۔“

”دلپ خدا کے لئے مجھے بھول جاؤ۔۔۔ میری
خوبصورتی پر مت جاؤ۔ یہ ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے،
میں تو اس سماج کی گھناونی تصویر ہوں۔ اصلیت جان
کے بھی تم مجھے اپنانے کی سوچ رہے ہو۔“

”میں تمہاری مانگ میں سیندور بھرنا چاہتا ہوں اور

تمہارے بچے کی شناخت بننا چاہتا ہوں۔۔۔“

”نہیں دلپ“ کا جل بات کاٹتے گویا ہوئی۔

”میں اب دھوکہ نہیں کھانا چاہتی۔ میری کھوکھلی اور

بدنام زندگی میں اب رکھا ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ چلے جاؤ

یہاں سے۔۔۔۔۔ سب خود غرض ہیں۔۔۔۔۔“

کا جل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دلیپ ایک نئے جذبہ کے ساتھ آگے بڑھا۔

”کا جل میں نے تمہارا دل دکھایا۔۔۔۔۔ تمہارے

زخموں کو گریدا۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ پر یقین کر لو

تم میری نظروں میں پوتر دیوی ہو۔ اچھا کا جل

میں جا رہا ہوں البتہ مرتے دم تک تمہارا انتظار رہے گا۔“

جواب میں کا جل کی آبدیدہ نظریں اٹھیں اور جھک گئیں۔

”بھگوان تمہیں ہر حال میں خوش رکھے“ الوداع

یہ کہتے دلیپ کا جل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ اور اُس کے چلے جانے

کے بعد کا جل اپنی تقدیر پر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

دلیپ جاچکا تھا۔ البتہ نگلی زمین پر اُس کے پاؤں کے نشان صاف دکھائے دے

رہے تھے۔۔۔۔۔ کا جل جھکی اور نہ جانے کس جذبے کے تحت نشان والی مٹی مٹی میں لی۔

اتنے میں بادل گرے، بجلی چمکی اور تیز ہوا کا جھونکا آیا کہ کھڑکی کے پٹ زور

سے بجنے لگے۔

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا

اب کا جل تھی اور خالی کمرہ اور سامنے چٹائی پر پڑا کالج کا سپروائٹ۔

دلیپ کے آخری الفاظ اُس کے کانوں سے ٹکرائے
 ”کاجل پیار کے اِس سفر میں مجھے ثابت قدم پاؤ گی۔۔۔ میں دھوکہ باز نہیں۔
 اِس کے بعد طرح طرح کے خیالات اُس کے ذہن میں ابھرے۔۔۔ یاسیت
 واداسی سے لبریز خیالات۔
 کاجل نے ادھ بھری بوتل کو گلاس میں انڈیل کے پینا شروع کیا تاکہ ماضی کی تلخ
 یادوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔



اتفاق کی بات

کچھ وقت امین آباد پارک میں گزارنے کے بعد الطاف سڑک پر آ گیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر مختلف چیزیں فروخت کرنے والوں پر سرسری نظر دوڑائی اور پھر پاس ہی چائے خانے میں گھس گیا۔

وہاں اور بھی لوگ بیٹھے تھے اور کچھ طرح طرح کی باتیں کرنے میں مشغول۔۔۔۔۔ الطاف چپ چاپ جائزہ لینے لگا اور پھر ایک کنارے کی میز کی چاروں طرف پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

چائے خانہ کے ایک لونڈے کو انگلی کے اشارے سے بلا کر ایک کپ چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔

چائے آ گئی، اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر کا خوش باش آدمی دوسری طرف سے آیا اور الطاف کے روبرو کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ پھر تکلفانہ انداز اپنائے پوچھا۔

”شاید آپ پہلی بار اس شہر میں آئے ہیں“

”آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں اجنبی ہوں“ الطاف بے تامل کہہ گیا۔

”ارے جناب۔ خوش باش آدمی بولا

”میں دیکھ رہا ہوں آپ کچھ دنوں سے اس بازار میں
چکر لگا رہے ہیں۔ بھلا یہاں رکھا ہی کیا ہے بھولے بھٹکے
کوئی کوئی چیز آ جاتی ہے اور پھر اڑ کر کہیں چلی جاتی ہے۔“
”آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ میں اجنبی ہوں۔ میں
نے اس بازار و ملحقہ بستی کا بار بار چکر لگایا لیکن مجھے
میرے مطلب کی چیز نہیں ملی۔“

”میں سرکار کی خدمت کر سکتا ہوں۔“
خوش باش آدمی نے ادھ جلتے سگریٹ کو ذور سر رک پر پھینکتے ہوئے کہا۔
”آپ کی تعریف یہ الطاف تھا۔“

”جناب تعریف تو خدائے برتر کی ہے جس نے یہ دنیا
تشکیل دی۔ ویسے مجھے دلدار خان کہتے ہیں۔“

”میرا نام الطاف احمد ہے۔ رامپور کارہنے والا ہوں۔ کچھ دن قیام رہے گا۔۔۔
آپ کا کیا شغل ہے“

”ارے جناب! آپ لوگوں کے سہارے جیتا ہوں،
خدمت بجالاتا ہوں اسی طرح گزارے کے لئے کچھ رقم
مل جاتی ہے۔“

دلدار خان کی باتیں سن کر الطاف گہری سوچ میں پڑ گیا۔ چائے ختم ہو گئی تھی۔
الطاف نے دلدار خان کی جانب سگریٹ بڑھایا۔ دونوں نے سگریٹ سلگائے
کونٹر کے پاس جا کے الطاف نے چائے کے دام چکائے اور دونوں چائے خانے سے باہر

آگئے۔

سڑک کے کنارے پر رکشا والا کھڑا تھا

دلدار نے اُسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

سلیک علیک کے بعد دونوں رکشہ پر سوار ہو گئے۔

”کہاں چلنا ہے خان صاحب“

”لاچت نگر چلو“ دلدار نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے اور

سگریٹ کا دھواں خاموش فضا میں بکھیرتے رہے۔

قریباً آدھ گھنٹے کے بعد رکشہ ایک چوراہے پر پہنچا۔

”اب کدھر چلوں صاحب“

”بس سیدھے چلے چلو“

دلدار خان نے انگلی کے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا

”وہ جو دائیں جانب سیاہ گیٹ والا بنگلہ نظر آ رہا ہے وہیں پر روک دینا۔“

رکشہ کے رُکتے ہی دونوں اتر پڑے۔ دلدار خان نے کرایہ چکایا اور پھر بنگلے میں

گھس گئے۔

مرکزی دروازہ سے ایک وسیع و عریض سجے سجائے کمرے میں پہنچ کر الطاف

اجنبھا میں پڑ گیا۔

دلدار نے الطاف کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندرونی زینہ چڑھتا ہوا نظروں سے

اوجھل ہو گیا۔

الطاف نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔۔۔ نگاہیں چاروں سمت طواف

الطاف بڑا کر اٹھ بیٹھا

سامنے دلدار خان ہنس رہا تھا۔

”الطاف صاحب معاف کرنا کچھ دیر لگی۔ یہ جگہ ہی ایسی ہے۔۔۔ سب کچھ

بھول کے انتظار کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔“

”دلدار خان کام کی بات کرو۔“ الطاف بات کاٹتے کہہ گیا۔

”کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔ بس آہی رہی ہوگی مالکن“

”مالکن۔“ الطاف کو تعجب ہوا ”مالکن سے تمہارا مطلب؟“

”اس بنگلہ کی مالکن کے بارے میں کہہ رہا

ہوں۔۔۔۔۔ گزشتہ پندرہ برسوں سے اس بنگلہ و

مالکن سے وابستہ ہوں۔۔۔۔۔ آج تک کسی کو نہیں معلوم

کہ یہ بنگلہ بھی ایک مہذب فوجہ خانہ ہے۔ گرچہ مالکن کی

جوانی کب کی دم توڑ چکی ہے۔ پھر بھی اُس کی رعنائی

میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اُس کی ہر ادا میں شرافت اور

باتوں میں امرت نے بسیرا کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ ایک

شریف بیوہ ہے اور میں اس کا بھائی ہوں۔“

یہ کہہ کے دلدار خان کی آنکھیں بھر آئیں

ٹھیک اُس وقت ایک ادھیڑ عمر کی سفید پوش خاتون زینہ سے نیچے اُتری اور آکر

الطاف کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

چونک کر اُس نے عورت کی طرف دیکھا۔۔۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا

”کیا بات ہے الطاف بھائی“ دلدار خان نے جھنجھوڑا

”حسینہ“ الطاف زور سے چیخ پڑا۔

ساتھ ہی حسینہ سے لپٹ کر کہنے لگا

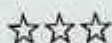
”میں برسوں سے تمہاری تلاش میں ہوں۔ تم آج

بھی میرے لئے وہی حسینہ ہو جو برسوں پہلے تھی۔۔۔۔

آؤ میری ظلمت بھری زیت میں رعنائی بھر دے۔“

جواب میں حسینہ کی ہچکیاں بندھ گئیں

اور دلدار خان پاس میں کھڑا ہکا بکا دونوں کو دیکھتا رہا۔



خلاصی

سورج آنگن میں اپنی نورانی شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ چڑیاں چہچہانے لگیں تھیں۔ البتہ برتن دھونے پانی بھرنے یا جھاڑو دینے کی آواز خلاف توقع نہیں آرہی تھی۔ پچھلے قریباً دس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا جب عاصفہ صبح مقررہ وقت پر نہیں جاگی تھی۔ ویسے عاصفہ علی الصبح اذان کی آواز کے ساتھ ہی جاگ جاتی تھی۔ آج بھی اُس نے حسب سابق اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بستر سے اُٹھتے ہی اُس کے پاؤں ڈمگ گئے۔ سارے بدن میں کھالت اور سُستی سمانے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے عاصفہ کٹی شاخ کی طرح بستر پر گر پڑی۔

ممائی جان کو آج سویرے ہی دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

”یہ عاصفہ کی بچی اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ سورج سر پر آچکا ہے اور شہزادی کی بچی اُٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ جنم جلی کہیں کی۔ اس منحوس کو اتنا بھی احساس نہیں کہ ناشتہ وقت پر تیار نہ ہونے سے نعیمة کو کو چنگ جانے میں دیر ہو جائے گی۔“

عاصفہ کا سارا جسم مانو ٹوٹ چکا تھا۔ ممائی کی جلی کٹی باتیں سن کر اُس نے دوبارہ بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن دفعتاً آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور چکر کے رگر پڑی۔

ممائی جان کے چیخنے چلانے کے بعد ماموں جان کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔

”کوئی قیامت آجائے گی اگر آج اپنے ہی ہاتھوں

سے ناشتہ تیار کر لوگی۔ تمہیں تو ہر وقت بے چاری کو گالیاں
 دینے سے مطلب ہے۔ ہر وقت گالی گلوچ سے کام لینا تم
 نے اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ محلے والوں کے سامنے تم نے میرا
 سر نیچا کر دیا ہے۔ روزِ محشر میں اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں
 گا۔ عاصفہ اب بچی نہیں رہی ہے۔ اب تو خدارا اپنی بے
 جا حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی طبیعت
 واقعی خراب ہو۔ اُس کا حال جاننے کے بجائے خواہ مخواہ
 بکیتی رہتی ہو۔“

یہ کہتے ماموں سجاد ڈاکرے میں گھسا۔ عاصفہ کو بستر پر روتے پایا۔ بُخار کی
 شدت سے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ چونک پڑا۔
 ”بیٹی عاصفہ! تمہیں تو تیز بخار ہے۔ تم کتنا کچھ
 برداشت کرتی ہو۔ بیٹی تمہارا یہ صبر و ضبط ایک دن ضرور
 رنگ لائے گا۔۔۔ میں ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں۔“

ماموں کے چلے جانے کے بعد عاصفہ کو یقین تھا کہ اب حال پوچھنے کی خاطر
 ممائی جان یا نعیمہ بہن آ جائیگی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔۔۔ اتنے میں گئے گذرے واقعات و
 احساسات عاصفہ کی دماغی وسعتوں میں ابھرنے لگے۔۔۔ وہ سوچوں کی دنیا میں کھو گئی۔
 ”ممائی جان غلط کیا کہتی ہے وہ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ
 میں جنم جلی، منحوس اور بد بخت ہوں۔ میں ہی اپنے ماں
 باپ کی موت کا سبب بنی۔ زلزلہ آیا۔ ساری پہاڑی بستی

تباہ و برباد ہو گئی۔ میں اندر کوٹھری میں پھنس گئی تھی۔
والدین چاہتے تو مجھے چھوڑ کر اپنی جان بچا سکتے تھے۔
لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھ بد نصیب کو بچانے کی
کوشش میں کونٹھے کا سارا ملبہ نیچے گر آیا اور وہ دونوں اُس
میں دب کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ساری بستی ماتم کدہ بنی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار کی دل خراش آوازیں اور لاشوں
کے انبار بے بسی کے عالم میں والدین کی دائمی جدائی پر میں زار و قطار رورہی تھی۔ اسی عالم
میں ماموں جان نے مجھے اپنے ساتھ گھر لایا۔۔۔ میں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔
نعیمہ تب دوسری جماعت کی طالبہ تھی۔ ماموں نے چاہا میں بھی اسکول میں داخلہ لوں۔ لیکن
ممائی کو یہ تجویز ایک آنکھ نہ بھائی۔ ممائی ٹرٹس مزاج کی تھی اور ماموں جان بھی اُس کا سامنا
مردوں کی طرح نہ کر پاتے تھے۔ بلکہ دب کر رہتے تھے۔ میرے ہاتھ سے بستہ چھین
کر چلائی:-

”تمہارے ماں باپ دولت کے انبار نہیں چھوڑ گئے

ہیں کہ تمہاری پرورش بھی کریں اور پڑھائیں بھی۔ کان

کھول کر سن لو یہ باورچی خانہ ہی تیرا اسکول ہے اور یہ

برتن و جھاڑو تیرے کھلونے۔“

آئیے ڈاکٹر صاحب! بچی بخار سے تپ رہی ہے“

ماموں سجاد ڈاکر کی آواز نے عاصفہ کو چونکا دیا۔ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ

تھی۔ کھر درالستر اور سامنے ڈاکٹر و ماموں جان۔ ڈاکٹر نے ملاحظہ کیا۔

”اے تو تیز بخار ہے۔ سرد پانی کی پٹیاں سر پر رکھ دیجئے

اور یہ دوائی دودھ گھٹے بعد ایک نکیہ اور دو چمچ مکسچر۔۔۔ کھانے کو

ڈبل روٹی اور دودھ دیجئے۔ اے آرام کی ضرورت ہے۔ میں

شام کو پھر دیکھنے آؤں گا۔

”ڈاکٹر صاحب یہ جنم جلی تو بیماری کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔

در اصل یہ کام چور ہے بس بیماری کا بہانہ بنا کر بیٹھتی ہے۔“

ممانی عابدہ سے برداشت نہ ہوا اور دل کا غبار نکال کے دالان کا رخ کر گئی۔

سجاد ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر آیا۔ تو ڈاکٹر علوی نے پوچھ لیا۔

”کیا یہ اس گھر کی نوکرانی ہے؟“

”نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ بد نصیب تو میری بھانجی

ہے۔ اس کے والدین زلزلہ میں وفات پا گئے۔ افسوس

اس بات کا ہے کہ میری بیوی نے اُسے اپنا نہیں سمجھا بلکہ

نوکرانی سے بھی بدتر سلوک روا رکھا۔“

ڈاکٹر علوی کا کلنک پاس ہی بستی میں تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ کرایہ کے فلیٹ

میں رہتا تھا۔ والد انجینئر کمیل احمد ملازمت کے سلسلے میں جموں میں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر

علوی کو عاصفہ کی حالت پر سخت افسوس ہوا۔ شام کو وہ از خود اُسے دیکھنے چلا گیا۔ اور طاقت

کی دوائیاں بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ عاصفہ بھی شفقت بھری نظروں سے ڈاکٹر علوی کو

گھورنے لگی۔ ازراہ ہمدردی ڈاکٹر عاصفہ کے پاس بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتوں میں اُس کا

دل بہلانے لگا۔ اور جب عابدہ کو علم ہوا کہ ڈاکٹر علوی کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ

نعیمہ کو کسی نہ کسی بہانے اُس کے کلنگ بھیجتی رہی۔ اور پھر سجاد ڈار سے بھی بات چھیڑی کہ اپنی نعیمہ بیٹی اب بی اے کا امتحان دے رہی ہے کیوں نہ اُس کی شادی کی بات ڈاکٹر سے کی جائے۔ سجاد ڈار نے بات اُن سنی کر دی کیونکہ وہ بھانپ چکے تھے کہ ڈاکٹر اندر ہی اندر عاصفہ کو چاہنے لگا ہے۔

جب بھی ڈاکٹر علوی آجاتے تو عابدہ اپنی بیٹی نعیمہ کو ہدایت دیتی کہ اُس کے پاس زیادہ وقت اس اُس بہانے گزارا کرے۔ ساتھ ہی عاصفہ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتی۔

”آج شام میری ماں عاصفہ کو دیکھنے آئے گی۔“

ایک روز ڈاکٹر علوی نے سجاد ڈار کو شرماتے ہوئے کہہ دیا۔ اور اُس نے کچھ بسکٹ اور ڈرائی فروٹ خرید کر لائے۔ عابدہ کو ڈاکٹر علوی کی ماں کے آجانے کی خبر کیا ملی کہ خوشی سے پھولے نہیں سائی۔ کالج سے واپس آنے پر نعیمہ کو الگ کمرے میں بلا کر ہدایت دی کہ بناؤ سنگار کے ساتھ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر ڈاکٹر کی ماں کے سامنے آنا۔ اس کے بعد عاصفہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”دیکھو منحوس کی بیٹی آج ڈاکٹر صاحب کی ماں نعیمہ کو دیکھنے آرہی ہے۔ تم کسی بھی صورت میں سامنے آنے کی کوشش نہ کرنا۔ بس رسوائی گھر میں کام کرتی رہنا۔ شربت اور پھر چائے نعیمہ خود لائے گی۔“

”جی ممانی جان“۔ عاصفہ مری مری آواز میں اتنا کہہ گئی۔

شام کو ڈاکٹر علوی کی ماں آگئی تو عابدہ نے گرمجوشی کے ساتھ اُس کا استقبال کیا

اور پھر نعيمہ شربت اور پھر چائے لے کر سامنے آگئی۔

”یہ ہماری بیٹی نعيمہ ہے۔ بی اے کا امتحان دے رہی

ہے۔ ڈاکٹر بننے کا شوق رکھتی ہے“ عابدہ نے پہل کی

”لیکن علوی بیٹے نے عاصفہ بیٹی کی بابت کہا تھا۔“

”ارے بہن اُس بد نصیب کو لیکر کیا کرو گی۔ پیدا

ہوتے ہی اپنے ماں باپ کو کھا گئی۔“ عابدہ نے لقمہ دیا

”لیکن میرے بیٹے کی پسند عاصفہ ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“

اتنے میں ماموں سجاد اپنی بھانجی عاصفہ کو لیکر سامنے آیا۔ ڈاکٹر علوی کی ماں نے

اُسے گلے لگایا اور ماتھا چوما۔ اُس کے بعد ہینڈ بیگ سے سونے کا ہار نکال کے اُس کے گلے

میں ڈال دیا۔ ماموں اندر ہی اندر اتنا خوش کہ جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔

سادہ تقریب میں نکاح خوانی کی رسم ادا کی گئی۔ اور جب بیٹی عاصفہ کو رخصت کیا

تو ماموں سجاد ڈار نے گلوگیر آواز میں ڈاکٹر سے کہا

”علوی بیٹے عاصفہ کو لے جاؤ! اسی بستی سے کوئوں

دور جہاں تلخ ماضی کا سایہ تک اُس کا ساتھ نہ دے۔ بارہ

برس کی قید با مشقت کے بعد اُسے خلاصی ملی ہے۔ اس

گھر میں ایک باندی کی طرح کام کرتی رہی“

ماموں سجاد ڈار کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ مگر اُس کے چہرے

پر ابدی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

اُجاڑ

”کم بخت کہیں کی، ہزار بار کہہ دیا کہ صبح اپنا منخوس
چہرہ مجھے نہ دکھایا کرو۔ تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ تم
بانجھ ہو اور سویرے بانجھ عورت کا چہرہ دیکھنا بہت بُرا سمجھا
جاتا ہے کتنی بار کہوں کہ سویرے میرے سامنے نہ آیا کرو۔“

”ماں جی! اس میں میرا قصور کیا ہے؟“

”بارہ برس ہو گئے شادی کو اور ابھی تک چوہے کا پچہ
تک پیدا نہ کر سکی۔ تم تو بنجر زمین ہو۔ یکدم اُجاڑہ۔ اُجاڑہ
زمین سے کسی قسم کی پیداوار کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ آئندہ
سویرے میرا راستہ کاٹنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم پر تو خدائے
تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہے“

نائیلہ کی ساس نے اُسے دیکھتے ہی زہرا گلنا شروع کر دیا۔ اور نائیلہ بے چاری
دم بخود ہو کر ساس کے چلائے ہوئے نشتر حسب سابق اپنے معصوم دل پر سبے جا رہی تھی۔
اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے ازراہ مروت اپنے سُسر کی جانب عاجزانہ انداز میں

جھانکا۔ اُس کے دتیرے سے بھی اُسے رحم یا ہمدردی کے بجائے نفرت و حقارت ہی نظر آئی۔

دل مسوس کر رہ گئی نائیلہ۔ گرتے کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے جھاڑو اٹھائے دالان میں فرش صاف کرنے کی غرض سے گھس گئی۔ ساس اور سُسر کے بار بار کے طعنے اُس کی دماغی وسعتوں میں ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

صحن کی صفائی کرتے نائیلہ سوچنے لگی کہ کیا اولاد پیدا نہ کرنے کے جرم میں فقط عورت ہی سزا کی حقدار ہے کیا اس میں مرد کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

ویسے نائیلہ کا شوہر عماد اُسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ دونوں شادی کے بعد سے ہی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے تھے۔ ازدواجی زیست سے وابستہ بارہ برس خوش گوار انداز میں بیت گئے۔ کبھی بھی ایک دوسرے کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہ ملا۔ یہی وجہ تھی کہ ساس اور سُسر کی بے مروتی و درخت اندازی سے لبریز سلوک اپنانے کے بعد بھی نائیلہ شریک زندگی کی محبت و ہمدردی کے باعث اطمینان کی زندگی گزار رہی تھی۔

نائیلہ بارہا عماد کو سمجھاتی رہی۔

”دیکھو جی! میرے ساتھ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس چلو۔ اپنا چک اپ کرا لو۔ میں بھی اپنا چک اپ کراؤں گی، ہو سکتا ہے کہ ہمارے سونے آنگن میں ننھا مہکتا پھول کھل سکے۔ ہماری ویران زندگی میں بھی بہار آئے۔“

”نائیلہ اولاد کا ہونا نہ ہونا کردگار کے ہاتھ میں ہے

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تم میری شریک حیات ہو، زندگی کا ساتھی، ہم پہلے۔ میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔ تمہاری شرکت میں ساری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ بچے نہیں تو کیا ہوا۔ خدا کی مشیت کے آگے کسی کا کیا دخل۔ میں تو خوش قسمت ہوں کہ تم جیسی زیرک اور محبت کرنے والی بیوی ملی ہے۔ کیا اولاد کے بغیر لوگ زندہ نہیں رہتے۔“

والدین عماد پر زور دیتے رہے کہ دوسری شادی کر لے تاکہ اُن کو پوتا پوتی کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ عماد نے اُن کی چاہت کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا۔

”میں مرنا پسند کروں گا مگر نائیلہ کو موجودگی میں دوسری شادی کی بابت سوچنا بھی گناہ تصور کرتا ہوں۔“

دن بھر ساس سُسر کی جلی کٹی باتیں سُن کر نائیلہ شام کو عماد کی پیار بھری صحبت میں شب کچھ بھول جاتی تھی۔ عماد کے علاوہ اُس کی نند عارفہ بھی نائیلہ کو بہت چاہتی تھی۔ والدین کے غیر مساویانہ سلوک کے برعکس عارفہ بھابی کا دکھ بانٹنے کی نیت سے دلاسا دیا کرتی تھی۔

”بھیا! ابا اُمی بے چاری بھابی کو روز تنگ کرتے

ہیں۔ گالیوں سے نوازتے ہیں وہ تو بس دن بھر خاص کر آپ کی عدم موجودگی میں رویا کرتی ہے۔ آپ دوسری شادی کر لو ہو سکتا ہے کہ ابا اُمی کی اولاد سے متعلق خواہش

بھر آئے۔“

ایک روز عارفہ نے صلاح دی

”عارفہ! میں دوسری شادی کی بابت سوچنا بھی گناہ

تصور کرتا ہوں۔ جو پیار میرے دل میں نائیلہ کے لئے

وقف ہے میں اُسے بانٹ نہیں سکتا۔“

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ عماد کو دفتری کام سے مہینہ بھر کے لئے لداخ جانا

پڑا اس دوران نائیلہ کو ساس سُسر کی جلی کٹی سُننی پڑی۔ وہ اپنی بد نصیبی پر فقط خلوت میں

آنسو بہایا کرتی تھی۔ لے دے کے ایک عارفہ ہی اُسے صبر کرنے کی تلقین کیا کرتی تھی۔

عارفہ کے سہارے ہی نائیلہ وقت گزرتی تھی۔ ایک مہینہ گزرنے کے بعد بھی عماد واپس

نہیں آیا۔ ہر ایک کو فکر لاحق ہو گئی۔

ایک روز ڈاکیر جسٹرڈ لفافہ نائیلہ کے نام لے آیا جسے عارفہ نے وصول کر کے

بھابھی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”بھابھی یہ لو بھیا کا خط، اب تو خوش ہو جاؤ، رورو کے اپنا کیا حال بنا دیا ہے“

اگلے روز نائیلہ حسب معمول سویرے نہیں جاگی۔ اُس کی عادت تھی سویرے

اُٹھ کے صحن والے نلکے سے پانی بھرنا، صفائی کرنا اور ناشتہ تیار کرنا۔

عارفہ نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

”کیا بات ہے عارفہ، خیر تو ہے“

ماں بھابھی اُنھی نہیں ہے۔ دروازہ بھی نہیں کھولتی۔“

”آخر بات کیا ہے“ ماں تذبذب میں پڑ گئی۔

”کل بھیا کا خط بھابھی کے نام آیا تھا۔ نہ جانے اُس میں کیا لکھا تھا“ یہ عارفہ تھی۔

دروازہ توڑ دیا گیا۔ سامنے فرش پر نائیلہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں عماد کا خط تھا۔ عارفہ نے بھابھی کو اٹھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اُن کی رُوح قبضِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

عارفہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اتنے میں نائیلہ کے سر نے عماد کے خط کو ہاتھ میں لیا۔ اور پریشانی کی حالت میں پڑھنے لگا۔

جان سے پیاری نائیلہ

”آج میں تم پر ایک راز کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں
 اس اُمید کے ساتھ کہ تم مجھے معاف کرو گی۔ تم ہمیشہ
 میرے والدین سے بانجھ ہونے کے طعنے سُنتی رہی۔
 میری خاطر تم غم و اندوہ کے نشتر جگر پر سہتی رہی۔ ان
 طعنوں اور نشتروں کا حق دار تو میں ہوں۔ ہاں اصل مجرم
 میں ہوں! ڈاکٹر نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا کہ میں
 کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ مرد تو تھا البتہ بچہ پیدا کرنے کی
 صلاحیت مجھ میں عنقا تھی۔ میں خود غرض تمہیں دل و جان
 سے چاہتا تھا اس لئے اس اہم راز سے تمہیں واقف نہ
 کیا۔ جو قدم میں آج اٹھانے جا رہا ہوں نہ اٹھاؤں تو
 تمہاری زندگی یونہی اجیرن بنی رہے گی۔۔۔ مجھے بہت
 پہلے یہ قدم اٹھانا تھا لیکن میں تمہیں اپنے سے جُدا نہیں
 کرنا چاہتا تھا۔ یہ سراسر میری خود غرضی تھی۔ جس کے لئے

خداۓ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ میرے والدین
 میری دوسری شادی کرنے پر بضد ہے۔ میں نہیں چاہتا
 کہ تمہاری طرح میں کسی اور لڑکی کی زندگی بھی بُرا کر
 دوں۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ اس دنیا میں میرا جینا
 فضول ہے بے کار ہے۔۔۔ جب تک تمہیں یہ خط ملے گا
 میں اس بے وفادار کو خیر باد کہہ چکا ہوں گا۔

میری طرف سے نائیلہ آخری التجا ہے کہ تم اپنی پسند
 سے دوسری شادی کر لینا۔ تاکہ میرے گھر یعنی قید خانے
 سے تمہیں رہائی مل سکے۔ اُمید کہ مجھے اس بابت مایوس
 نہیں کرو گی۔“

تمہارا گناہ گار عماد

پورے گھر میں ماتم چھا گیا۔ ساس اور سُسر نائیلہ کو فرش پر سے اُٹھانے لگے جو
 بے جان مورتی کی طرح اکڑ گئی تھی۔ عماد کی راہ پر گامزن نائیلہ نے بھی اس عارضی دنیا سے
 سدا کے لئے ناطہ توڑنے میں اپنی عافیت جان لی۔



زمانے کے رنگ

کچھ روز سے ایک سیاہ سایہ، تعاقب تو نہیں ساتھ ضرور دے رہا ہے میں جب دفتر جانے کیلئے نمائش سٹینڈ پہنچتا ہوں تو سایہ اکثر اوقات موجود ہوتا ہے۔ چھانہ پورہ گاڑی میں سوار ہوتا ہوں تو وہ سایہ بھی حسن اتفاق سے ساتھ ہو جاتا ہے۔ گو مجھے چھانہ پورہ کے آخری بس اسٹینڈ پر اترنا پڑتا اور سایہ یا برقع والی پہلے ہی مائسمہ کالونی کے پاس اتر جاتی تھی۔ جتنی دیر نمائش گاہ کے اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑا رہنا پڑتا یا جب وہ شاید بادل نحو استہ جد ا ہو جاتا اتنی دیر تک نقاب کی جالیوں کا رخ (جب بھی نگاہ اس طرف جاتی) اپنی جانب معلوم ہوتا۔

اکثر سوچا کرتا کہ یہ برقع پوش خاتون دوسری گاڑی میں سفر کیوں نہیں کرتی۔ بہت ساری گاڑیاں اور میناڈار چھانہ پورہ سے ہو کر جاتی ہیں۔

ایک دن جان بوجھ کر دس پندرہ منٹ دیر سے میں اسٹینڈ پہنچا وہ سایہ برابر موجود تھا۔ اگلے روز جان بوجھ کر آدھ گھنٹہ دیر کر دی پھر بھی متذکرہ سایہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔۔ ایک دن میں نے چھانہ پورہ کی تیار میناڈار چھوڑ دی۔ برقع پوش بھی اس میں سوار ہو گئی تھی وہ اتر پڑی اور میرے ساتھ دوسرے میناڈار میں سوار ہو گئی۔

کیا بتاؤں کہ وہ کیسا سایہ تھا۔

بھرا بھرا جسم۔۔ گورے گورے اور چوڑے ہاتھ لمبی لمبی انگلیاں جیسے قلمی مچھلیاں، دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں انگوٹھی۔

مندری پر حرف "A" کنندہ

پنڈلیوں تک سیاہ ریشمی برقع۔۔۔۔۔ پنڈلیوں سے نیچے گلابی شلوار کیا بتاؤں کہ اس برقع کے تعاقب سے مجھ پر کیا گزری۔ طرح طرح کے خیالات دل و دماغ میں ابھرنے لگے۔

بیگم سے جان کی امان اور بچوں کی جان کا صدقہ طلب کرتے ہوئے صحیح عرض کرتا ہوں کہ زندگی میں شاید پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ ابھی مجھ میں دم خم ہے۔ کیا ہوا اگر سفید چاندی جیسے بال بکثرت سر کی کھیتی میں اپنا اعلان کرنے لگے ہیں۔ ہونہ ہودل میں کچھ کالا نہ سہی گرم مصلحہ ضرور ہے۔

یقین کیجئے جہاں اپنی صورت خدائے برتر نے ایسی نہیں بنائی کہ دیکھ کر راہ چلتوں کو قے آجائے وہاں کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرا تھا کہ ہم بھی یوسف کشمیر ہیں جہاں دیکھ کے سایہ یا برقع اپنی انگلیاں شہید کر دے۔۔۔ یوسف ہونے کی بات دور کی صاحب ہمیں تو اس قابل بھی صورت نہیں ملی کہ کوئی محترمہ کسی محفل میں اتفاق سے ہی ہمیں منہ لگائے۔ ہمارے دل میں حسرت بھی نہیں اٹھی کہ ہم اس لائق بین کہ کوئی قبول صورت محترمہ ہماری بابت سوچے۔

ہائے بیگم کی حسرتوں وار مانوں کا خون کیسے ہوا! یہ تو بیگم کی نوازش ہے کہ میری صورت سانولی قرار دے کر اپنے دل کو سمجھانے میں کامیاب اتری۔ لیکن پھر بھی میری بے راہ روی سے لبریز طبیعت کے باعث بدگمانیاں جنم لینے لگیں۔ نہ جانے کیوں بیگم کو میرے پیار پر دشا اس نہ رہا۔۔۔۔۔ میں اس کا دل رکھنے کیلئے اور اس خیال سے کہ پردیس کی لڑکی ہے کچھ کہتا بھی نہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس وادی میں اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہیں ہے۔ کیوں نہ میں ہی صبر کی سل دل پر رکھوں۔ ویسے میں زبان کھول دوں تو مخالفین بھی داد

دیئے بغیر نہیں رہتے لیکن نہ جانے کیوں میں غصے میں آئے فقط بیگم سے بات چیت کا سلسلہ کچھ وقت کیلئے منقطع کر دیتا ہوں۔

پہلے پہل اپنا خون پسینہ ایک کر کے تھکا ہارا جب بھر پہنچ جاتا تھا تو ازراہ اُلفت بچوں کی امی کی خوشامد کیا کرتا تھا تا کہ اس کی پیشانی کی شکنیں دور ہوں لیکن جب میری خوش اخلاقی کا خاطر خواہ جواب نہ ملتا تو میں نے اپنا رویہ بدل دیا اور اب تو صفائی میں کچھ کہنے یا سننے کے بجائے چپ سادھ لینے میں ہی اپنی خوشی جانتا ہوں اور اس بدلتی روش کا پھل لگتا ہے، خدائے برحق نیک ہی دے گا۔

میں اڈار اکثر لدی بھری ہوتی ہے تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اور اکثر کھڑے کھڑے سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس پر ہنگم صورتحال میں خوش پوش جیب کترے خوب مزے میں رہتے ہیں البتہ صنف نازک کیلئے کچھ سیٹیں مخصوص کر دی گئی ہیں کیا مجال کہ کوئی مرد ذات اس مخصوص نشستوں پر قبضہ جمائے۔

ایک دن نگ آ کر لالچوک میں بس اسٹینڈ میں اترنے پر میں محترمہ سے مخاطب ہوا۔

”کچھ روز سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ میرا تعاقب کرنے لگی ہیں، کیا اس کا سبب جان سکتا ہوں“

”تعاقب میں آپ کا کر رہی ہوں یا آپ میرا کر رہے ہیں“
اُس نے نپلی تلی زبان میں جملہ ادا کیا کہ میں اچھنبے میں پڑ گیا۔۔۔ اس قدر نفیس ملبوسات میں ملبوس دو شیرازہ اور آواز اس قدر کرخت، خیر میں نے الجھنا نہ چاہتے ہوئے اور محترمہ کے منہ نہ لگنے کی خاطر کہہ دیا۔

”ہوسکتا ہے کہ میرا ہی قصور ہوا چھامعاف کر دیجئے۔“

”لیکن میں اب آپ کو کیسے چھوڑ دوں۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کہاں“ میری زبان غیر ارادی طور تذبذب میں کام کر گئی۔

”میرے گھر۔“ ”کس لئے“

”اپنی عزت کی حفاظت کیلئے آپ نے چلنا ہوگا۔“

”کوئی زبردستی ہے کیا“ میری حالت ابتر ہونے لگی۔

”سیدھے سیدھے چلئے ورنہ میں ایک اچھا ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔“

”میں تیار ہوں۔“۔۔۔۔۔ میں نے نہیں چاہا کہ بات آگے بڑھ جائے اور

سرراہ میری عزت نیلام ہو جائے مجبوراً بھرے بھرے قدم اٹھاتا اس کے ساتھ چل دیا۔

مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا کہ کہیں یہ سیاہ برقع میری زندگی میں انار کی نہ لائے۔ آبی گذر کی بند ڈوالی گلی میں گھس کر ایک گھر کا پٹ کھول دیا ”آئے! اندر آجائیے“

میں دروازے کے اندر گھس گیا اور کمرے میں ایک محترمہ نے استقبال کیا اور پھر

یقین کیجئے میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ معاملہ ہی ایسا تھا!

سیاہ برقع کے اندر سے کوئی حسینہ نہیں بلکہ میرے جانے پہچانے بچپن کے دوست

انور احمد نکلے۔۔۔۔۔ میں اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ یہ سوانگ اُس نے کیوں رچایا۔ ہم

دونوں گلے ملے اور دور کھڑی اس کی اہلیہ شی ہنتے ہنتے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ میں تذبذب

میں کچھ پوچھنے والا تھا کہ انور کی زبان واہوئی:

”ارے امجد حال ہی میں جموں سے میرا تبادلہ ہوا ہے سوشل ویلفیئر محکمہ میں

ملازم ہوں چھانہ پورہ یونٹ میں پوسٹنگ ہے کیا کروں مینا ڈار میں جگہ مشکل سے ہی ملتی

ہے۔ اس مصیبت سے نجات پانے کی غرض سے میں آپ کی بھابی کا شلواری اور برقع استعمال کر لیا کرتا ہوں ایسا کرنے سے کم از کم گاڑی میں بیٹھنے کو سیٹ آسانی سے مل جاتی ہے۔ کیا کروں یونٹ کا انچارج سخت قسم کا آدمی ہے۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر آگ بگولہ ہو جانا اس کا معمول بن گیا ہے۔ نوکری کی سلامتی کیلئے میں نے یہ روپ دھار لیا ہے یونٹ میں گھس کر ڈریس تبدیل کرتا ہوں۔ یونٹ میں زیادہ عورتیں کام کرتی ہیں اس لئے کوئی ایک اصلیت نہیں جانتا ماسوائے چوکیدار کے جو اپنا راز دار ہے۔

جب سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے سفر آرام سے کٹ جاتا ہے آپ کو دیکھ کے میں نے تعاقب کرنا شروع کیا تا کہ اندازِ دیگر میں آپ سے رابطہ قائم کر سکوں۔۔۔ کیوں کیسی رہی یہ آٹھ برسوں کے بعد کی ملاقات۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچپن کے ایام اور پھر وہ چند سال نظروں کے سامنے رقص کرنے لگے جو ہم دونوں نے جموں میں ایک ساتھ گزارے تھے۔ ان دنوں بھی مقامی ڈرامہ منڈلی میں انور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ اب بھی بہروپیہ کا سوانگ رچانا اس نے ترک نہیں کیا ہے۔ اتنے میں بھابی شمی نے چائے لائی اور چائے نوش کئے میں رخصت لے کر گھر کی جانب چل پڑا۔

اور سوچتا رہا۔

اس سیاہ سایہ کے بارے میں

اپنے دفتر کی لاوارث و شکستہ عمارت کے بارے میں اور جانوروں کی طرح لدی پھندی مینا ڈوروں کے بارے میں۔ چلو کم از کم سیاہ برقع کے چکر سے نکل کر آرام کا سانس نصیب تو ہوا۔

کھر اور کھوٹا

عقیل صبح دیر گئے نیند سے بیدار ہوا۔ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر کمرے میں داخل ہوا تو میمونہ کو اپنا منتظر پایا۔ چائے پینے بیٹھا تو میمونہ نے کہا۔

”رات دیر سے آئے تھے۔ اور پریشان سے ہو۔ مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر معاملہ کیا

ہے“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے میمونہ“

عقیل نے روکھے پن سے کہا اور باہر دالان میں رکھی کرسی پر بیٹھ کے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔۔۔۔۔ سرسری طور کلیدی سرخیوں کو پڑھ کے اُس کے خیالات کا سلسلہ شروع ہوا۔۔۔۔۔

چاندنی کا حسین و دل کش چہرہ اُس کے روبرو منڈلانے لگا۔ اُس کی گفتگو کا انداز۔۔۔۔۔ اُس کا خوش اندازی سے گانا۔ اُس کا محبت سے لبریز برتاؤ۔۔۔ اور اُلفت بھری نظروں سے جھانکنا غرض چاندنی کا سراپا ایک کشش کی طرح عقیل کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔

دفتر میں عقیل کا دل کام میں نہیں لگا۔ بس یہ فکر تھی کہ کب شام ہو جائے اور یونس کی شرکت میں چاندنی کی صحبت اپنالے۔۔۔ گویا چاندنی کی دل لہھا دینے والی اداؤں نے عقیل کو دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ اُس کے لئے چاندنی کی ہر ادا رنگین اور ہر بات شیریں تھی۔

شام ڈھلے یولس کا انتظار کرنے کے بجائے چاندنی کے کوٹھے کی جانب عقیل کے قدم بڑھنے لگے۔

چاندنی خوشی سے پھولے نہ ساتی تھی کہ ایک اور شکار ہاتھ آگیا ہے۔ اُس نے عقیل کو اپنے ادھ ننگے سینے سے لپٹا لیا اور کاروباری لہجے میں گویا ہوئی۔

”عقیل نہ جانے تم نے مجھ پر کیا جادو کیا ہے دیکھو تو سہی اب میں نے کسی دوسرے سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا ہے۔ میرے دل و دماغ میں تمہارے خیال کے سوا اور کسی شے کا گذر ہی نہیں۔۔۔۔۔“

چاندنی نے موقع کا فائدہ اٹھائے رفتہ رفتہ چیزوں کی فرمائش شروع کر دی۔ ان مختلف چیزوں کی طلب کو جوش و جنون کی حالت میں عقیل نے بلاغذ قبول کر لیا۔ یہ خیال بھی نہ ہوا کہ اتنی فرمائش پوری کر سکے گا کہ نہیں۔ تنخواہ ملتے ہی عقیل سیدھا بازار گیا اور چاندنی کی طلب کردہ تمام چیزیں خرید لیں۔ تھری ویلر میں چیزیں چاندنی کے ہاں چھوڑ گھر کا رخ کیا۔

”میمونہ میرے قریبی دوست نے تین ہزار کی رقم ادھار لی ہے۔ مجبوراً دینے پڑے“

باقی بچی رقم میمونہ کے ہاتھ میں تھا عقیل کہہ گیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکلے لگا۔ میمونہ نے عقیل کا ہاتھ تھام لیا اور تاسف انگیز لہجے میں بولی

”دیکھئے صاف صاف کہئے معاملہ کیا ہے۔ رات کو دیر سے آیا کرتے ہو۔ اور نشہ کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ میرے ساتھ بولتے بھی نہیں۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ مجھ سے کوئی

قصور سرزد ہوا ہے تو میں نادم ہوں۔ میری کوئی حرکت یا عادت
تمہیں بُری لگی ہو تو بتا دو“

عقیل نے بے رخی کے ساتھ میمونہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور خہگی سے بولا۔
”رہنے دو ان باتوں کو۔ مجھے زیادہ بک بک کرنے کی فرصت نہیں۔“

اس کے ساتھ ہی عقیل باہر چلا گیا۔۔۔۔۔ شام کو حسب معمول کوٹھے کا رُخ کیا۔
۔۔ پردہ ہٹا کے چاندنی مخصوص کمرے سے داخل ہوئی۔ بلا کا سنگار تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی
ساڑھی میں اُس کا توبہ شکن خُسن اور بھی نکھر گیا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ اب زیادہ سے زیادہ وقت عقیل کوٹھے پر ہی گزارنے لگا۔
ایک شام چاندنی بناؤ سنگار کے بغیر ہی عقیل کے روبرو نمودار ہوئی۔ بغل گیر ہونے پر عقیل
کی زبان وا ہو گئی۔

”تمہاری بے عیب خوبصورتی میں کسی شے کی کمی رہ گئی ہے۔ زیور کیوں نہیں پہنے
ہیں آج“

چاندنی نے قدرے مچلتے ہوئے افسردگی میں ڈوبے ہوئے کہا

”وہ زیور میرے اپنے نہیں تھے۔ وہ اپنی سہیلی کو واپس کر دیئے ہیں“

”اچھا یہ بات ہے چاندنی مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں
دو چار روز میں زیورات کا بندوبست ہو جائے گا۔“

چاندنی نے عقیل کو بے وقوف بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اُس کی
خاطر تواضع میں بھی آگے آگے رہتی بلکہ ایسا بھی رویہ اپنایا گیا تھا کہ عقیل کو خیال تک بھی نہ
گذرے کہ وہ کسی اور سے راہ و رسم رکھتی ہے۔

میمونہ شوہر کو اُداس دیکھ کر فکر و اضطراب سے نڈھال ہو گئی۔ اُسے اندیشہ ہوا کہیں عقیل کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گیا۔ قریب آکر اُس نے اپنائیت سے لبریز لہجے میں دریافت کیا۔

”کیوں کیا بات ہے اس قدر پریشان کیوں ہو۔؟“

جواب میں عقیل ایک منجھے ہوئے اداکار کی طرح زار زار رُودنے لگے۔۔۔۔۔ شوہر کی خلاف معمول حرکت سے حیران ہو کر میمونہ نے پے درپے سوال کئے۔ جن کے جواب میں عقیل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

”اُس نے نوکری حاصل کرنے کے واسطے ایک نیم

سرکاری ادارے سے تیس ہزار کی رقم اُدھار لی تھی۔ جس کی ادائیگی

وقت پر نہ ہونے کے باعث ادارہ نے نالش کی دھمکی دی ہے۔

اگر نالش کر دی گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ میری عزت بُرا باد

ہو جائے گی۔ میں کیا کروں۔ اس ذلت سے چھٹکارا کیسے ہو۔“

اتنا کہہ کے عقیل میمونہ کی جانب مایوسانہ انداز میں دیکھنے لگا۔۔۔۔۔ میمونہ نے

گھبراتے ہوئے زبان واکی۔

”کہو اس بابت میں کیا کر سکتی ہوں۔ میری جان تک تمہارے لئے حاضر ہے۔

ویسے میرے میکے والے بھی اتنے امیر نہیں کہ یہ رقم ادا کر سکیں“

”میمونہ تمہارا کہنا بجا ہے البتہ ایک صورت ہے کیا کروں کہتے ہوئے بھی جان

جاتی ہے۔“

”اچھا کہہ تو دو۔“ یہ میمونہ تھی۔

”میمونہ اگر کچھ مدت کے لئے تم اپنے زیورات دیدو تو یہ

مصیبت ٹل جائے گی۔ زیور کسی کے پاس گروی رکھ کر میں قرض

ادا کر سکوں گا۔ کیا تم یہ قربانی میری بھلائی کی خاطر دے سکو گی“

”کیوں نہیں“

میمونہ کہتے ہوئے اٹھی لاکر میں سے زیورات کی پوٹلی اٹھالائی اور شوہر کے

ہاتھوں میں تھادی۔۔ اُس کے چہرے پر ذرہ بھی افسردگی کی جھلک نہ تھی۔ بلکہ عقیل کی

چاہت پوری کرتے اُسے مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

عقیل کا چہرہ بشارت سے لبریز ہوا اٹھا۔ اُس نے میمونہ کی جانب محبت بھرے

انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یقین نہیں پڑتا کہ تم اتنی بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاؤ گی۔ اپنے

سنگار کی چیزیں مجھے اٹھا کر دو گی۔“

اور پھر مسکراتے ہوئے زیورات کی پوٹلی بغل میں تھامے باہر کا رخ کیا۔

زیورات صاف کرا کے عقیل نے عقل کے اندھے کی طرح چاندنی کے ہاتھوں میں تھمائے

اور ساتھ ہی بغل گیر ہو گیا۔۔۔ چاندنی بے حد خوش کہ اُس کی مکارانہ روش کام کر گئی۔

اس بار اُس نے عقیل کو خوش کرنے کی ہر ترکیب اپنائی۔۔۔ باتوں باتوں میں پیانہ و صراحی

کے دور چلے۔ جام پر جام لٹا دھائے گئے۔۔۔ عقیل معمول سے زیادہ پی گیا۔ پوری

طرح نشے میں مدہوش ہوا تھا۔ چاندنی نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اُسے ایک

طرف دھکیل دیا اور خود ڈرنگ ٹیبل کے سامنے بناؤ سنگار میں لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ

اپنے چاہنے والوں کی محفل حسب دستور گرمانے لگی۔ شراب کے دور چلے اور پھر ناچ و گانا۔

بیروی

فیروز محکمہ سوشل ویلفیئر میں بحیثیت انسٹرکٹر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آج اُس کی طبیعت صبح سے ہی بھاری لگ رہی تھی۔ دفتر سے جلدی گھر آیا اور نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد بستر پر دراز ہوا۔ شریک زندگی ذاکرہ سردبانے لگی تاکہ کچھ آرام ہو۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔ فیروز جاگ پڑا۔ ذاکرہ نے دروازہ کھولا۔

اُن کا پڑوسی ریحان تھا جو مقامی ہسپتال میں کپیونڈر کے طور کام کرتا تھا۔ ریحان حسبِ عادت فیروز کے ساتھ ادھر ادھر کی گیس ہانکنے لگا۔ ذاکرہ چائے لیکر آ گئی۔ باتوں باتوں میں ریحان نے سماج میں سرعت کے ساتھ پھیلی اخلاق شکن سرگرمیوں کا ذکر چھیڑا۔ خاص کر آج کے کچھ کلیدی اخبارات کی سرخیوں کے توسط سے اُن قباؤں کا ذکر چھیڑا جو گھناؤنے طریقوں کو اپنائے مفلس و نادار والدین سے دودھ پیتی بچیاں خرید لیتی ہیں اور پھر ایک مخصوص انداز میں پال پوس کر اُن کو فوجی خانے کی زینت بنا دیتے ہیں۔ اتنے میں ریحان کو آج کا واقعہ یاد آیا اور سنانے لگا۔

”فیروز میں جس غرض سے یہاں آج آیا تھا وہ بھول ہی گیا تھا۔ ہاں تو رات گئے ایک دیہاتی اپنی بیمار بیوی کو

ہسپتال لایا تھا۔ بیوی وقت سے پہلے ہی ایک بچی کو جنم دے کر مر گئی۔ اور میں نے اندازہ لگایا کہ دیہاتی نوزائیدہ بچی سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ تم چاہو تو اس بچی کو گود لے سکتے ہو۔ تاکہ اس سونے گھر میں رونق آجائے۔“

”بچی کو کیا کریں۔ لڑکا ہوتا تو سوچ لیتے“

فیروز کے بجائے رسوئی گھر سے ذکرہ کی آواز ابھری۔

”بھابھی! ایک بے کس و مفلس بچی کو اپنا کر خدائے برتر

کی خوشنودی حاصل کر لو۔“

”ہم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے نادار بچوں کا“

ذکرہ کی بات سن کر فیروز کی حالت ہی بدل گئی۔ اُس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔۔۔ اُس کے ذہن میں گئے گزرے واقعات ایک ایک کر کے ابھرنے لگے۔ اُسے اپنی پیدائش کی کہانی یاد آ کے تڑپانے لگی جو اُس نے اپنے منہ بولے والد رمضان جواد کی زبانی سنی تھی۔

فیروز خود بھی بُرے نصیبوں والا بچہ تھا۔ اُس کے ماں باپ کا کوئی علم نہیں کہ وہ کون تھے۔ نہ جانے کون سی ماں تھی جس نے نو ماہ شکم میں میری پرورش کی اور دنیائے آب و گل میں آنے کے ساتھ ہی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔۔۔ نہ جانے باپ تھا بھی یا ماں کی عیاش فطرتی کی نشانی۔ منہ بولا والد رمضان علی الصبح ٹہلتے ٹہلتے پیر بابا کی درگاہ کی جانب جا رہا تھا کہ سامنے سیڑھی پر ایک معصوم بچہ کالی کبیل میں لپٹا روتا ہوا ملا تھا۔ اُس نے ازراہ انسانیت اٹھا لیا اور ایک بیٹے کی طرح پرورش کی اُس

درس عبرت

انور ایک غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔۔۔ اُس کے والد محکمہ اوقاف سے صرف تین سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔۔۔ کثیر العیال ہونے کے سبب گھر کا گذار بہت مشکل سے ہی ہوتا تھا۔۔۔ انور کو پڑھنے لکھنے کو بہت شوق تھا۔ کچھ والد کی کمائی۔۔۔ کچھ ٹیوشن اور کچھ وظیفی انجمنوں سے تعاون حاصل کر کے بی اے کی ڈگری حاصل کر ہی لی۔۔۔

یہ انور کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُسے والد کی کوششوں سے ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازمت بھی مل گئی۔۔۔۔ انور کو ملازمت کرتے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ اس کے والدین نے اُس کی شادی رچا دی۔۔۔۔ اور اپنی حیثیت کے مطابق خاصی دھوم دھام سے انور کی دلہن کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے۔

انور کی شادی کو تقریباً چار ماہ ہو گئے تھے۔ غریبی کے باوجود بھی دونوں کا وقت بہت عمدگی سے گذر رہا تھا کہ انور کو مجبوراً ملازمت کے سلسلہ میں ہندوستان سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ تین سال کے لئے ایگریمنٹ کر کے انور کو ویت چلا گیا۔۔۔

انور شریف النفس تھا اپنے والدین کا تابعدار اور اپنی رفیقہ حیات پر بہت مہربان تو تھا ہی۔۔۔۔ مگر ساتھ ہی اپنے کام میں بہت ہوشیار۔۔۔ مخفی اور کفایت شعار بھی تھا۔۔۔۔

کویت پہنچ کر اُس نے ہر مہینے بڑی پابندی کے ساتھ خاصی رقم بنک ڈرافٹ کے ذریعہ اپنے والدین کو بھیجی شروع کر دی۔۔۔ اور کچھ رقم وہ بنک میں بھی جمع کرتا رہا۔۔۔۔ تین سال کا طویل عرصہ انور نے اپنوں سے الگ رہ کر۔۔۔۔ اور خاص کر

شریکِ حیات سے جدارہ کر بڑی ہمت اور صبر سے گزارا۔ کبھی کبھی تو وہ ان سب لوگوں کی یاد میں پوری پوری رات جاگ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دیتا۔

خدا کر کے تین سال پورے ہو گئے۔۔۔ افران نے انور کی محنت اور ایمانداری سے خوش ہو کر از حد زور لگایا کہ انور مزید تین سال کیلئے ایگریمنٹ کر کے کویت میں رُک جائے۔ متعلقہ افران نے اُس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا۔۔۔۔۔ لیکن انور اپنے والدین کی زیارت۔۔۔ رفیقہ حیات سے ملاقات۔۔۔ بہن بھائیوں کی دیکھ بھال اور یار دوستوں سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔۔۔ اس لئے اس نے کمپنی کی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ اور گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔

ساحلِ ہند پر قدم رکھتے ہی انسانی فطرت کا تقاضہ ہوا کہ اتنی مدت کے بعد اپنے گھر واپس جا رہا ہوں۔۔۔ اس طرح خالی ہاتھ جانا بالکل بھی اچھا نہیں رہے گا۔ یہ سوچ کر وہ اپنا سامان مسافر خانے میں رکھ کر ایک دوست کے ساتھ بمبئی کے پُر رونق بازاروں کے چکر کاٹنے لگا۔۔۔ بیوی کے لئے سونے کے ٹاپس، کانچ کی چوڑیاں اور کچھ کپڑا وغیرہ خریدا۔ ماں کے لئے مناسب زیور اور دوپٹہ خریدا، بہن بھائیوں کے لئے کُرتے پاجامے اور والد کے لئے ٹوپی اور شیر وانی کا کپڑا۔

گھر پہنچتے ہی سب سے مل ملا کر ہر ایک کے لئے جو کچھ ہدیہ لایا تھا وہ اُن کو دے دیا۔ گھر بھر میں خوشی کا ماحول چھا گیا اور ہر سوسرت کی لہر دوڑنے لگی۔ انور کے والدین، بیوی اور بہن بھائی سب ہی خوش تھے۔

رات ایسی ہی خوشی میں گذر گئی صبح کو ناشتہ سے فارغ ہو کر دوستوں رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے چلا گیا۔ دوپہر کو یار دوستوں اور رشتہ داروں سے مل کر انور گھر واپس

کے منہ بولے والد نے اُسے پالنے میں لاکھ مصائب سہے تھے۔ اُس کی بیوی مر چکی تھی۔ اور اکیلے ہی فیروز کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ ماں کے پیار سے بھی نوازا۔ آٹھ برس کا تھا کہ بستی میں ہیضہ پھیل گیا۔ فیروز بھی اُس کی زد میں آ گیا اور رمضان جواد نے اُس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی فیروز کے کانوں میں اُس کے مرتے ہوئے منہ بولے والد رمضان کے الفاظ گونجنے لگے۔

”فیروز بیٹے جس طرح میں نے تمہاری پرورش کی ہے۔

اسی طرح غریب اور لاچار کی اعانت کرنا اپنا شعار

بنالینا۔“

والد کی اس آخری وصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے فیروز نے یتیم خانہ جا کے ایک بے آسرا لڑکی ذاکرہ کو شریک حیات کا درجہ بخشا۔ چھ برس ہو گئے شادی کو لیکن اولاد کی نعمت سے محروم۔ ریحان کی تجویز سن کر فیروز کو لگا کہ منہ بولے والد کی آخری خواہش کے تحت قرض چکانے کا وقت آیا ہے۔ فیروز ریحان کی شرکت میں ہسپتال کے سپرانڈنٹ کے پاس گیا۔ وہاں پہلے ہی ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی تھی۔ جو نوزائیدہ بچی کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔۔۔ نزدیک جا کے ریحان نے بوڑھی عورت کو پہچان لیا۔ وہ اپنے آپ کو بیوہ جتا کے بچی کو گود لینا چاہتی تھی۔ البتہ حقیقت میں وہ قحبہ شہراتن تھی۔ ایک بدنام اڈے سے وابستہ تھی۔ جہاں منشیات کا استعمال بے دریغ کیا جا رہا ہے۔ اور لاچار و مفلس عورتوں کو قحبہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

الغرض نوزائیدہ بچی کو فیروز نے حاصل کر لیا اور ذاکرہ کی گود میں ڈالے لے فخریہ

انداز میں بولے۔

”ذکرہ بچہ بچہ ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی اس لاچار کو پال کے

ہم اُس کردگار کے ہاں سرخرو ہوں گے۔“

ذکرہ نے بچی کو کلیجے سے لگا لیا۔ اُسے لگا اُس کی سونی گود بھر گئی اور منہ بولے

والد کی آخری خواہش کی پیروی کرتے ہوئے فیروز کو ایسا لگا کہ جہاں بھر کی خوشیاں اُس

کے دامن میں آگئی ہوں



آگیا، گھر کے دروازے پر اُس نے قدم رکھا ہی تھا کہ اُس کی ناک نے تیز قسم کی بدبو محسوس کی، جیسے لاکھ اور کپڑا جلتا ہو۔۔۔ انور ناک بند کئے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہہ اٹھا۔۔۔

”امی جان۔۔۔! چولہے میں کیا جل رہا ہے

۔۔۔۔؟ کپڑا گندھ جیسی بدبو آ رہی ہے“۔۔۔۔

یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہوا تو نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔۔۔۔۔ مسرت اور خوشی کی بجائے ہر جانب اُداسی و مایوسی دیکھنے کو ملی، ماں تو غصہ میں لت پت۔۔۔ بیوی کے چہرے پر یاسیت۔۔۔ اور بہن رضیہ پر افسردگی طاری تھی۔۔۔۔

انور حیران کھڑا تھا کہ اُس کی ماں نے چلا کر کہا۔۔۔۔۔

”جلتا کیا۔۔۔۔۔؟ تیری بیوی نے تیری لائی ہوئی

کانچ کی چوڑیاں چولہے میں ڈال دی تھیں۔۔۔ اُن کی

راکھ جل رہی ہے۔۔۔۔۔“

یہ سب تماشہ دیکھ کر اُس کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ غم اور غصہ کی شدت سے کانپنے لگا۔ رضیہ بہن سے دریافت کرنے پر اصلیت سامنے آ گئی۔۔۔۔۔ دراصل پرسوں ساس بہو کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے سے بولتی نہیں تھیں۔۔۔۔۔ انور جب پردیس سے واپس آیا تو اُس نے سب کو تحفے دیئے۔۔۔ صبح دوستوں سے ملنے کے لئے چلا گیا بیٹھے بیٹھائے ماں نے بہو سے طنزیہ انداز میں کہا۔۔۔۔۔

”مجھ سے لڑتی رہتی ہے اور میرے بیٹے کی لائی ہوئی

چوڑیاں پہنے خوب منگتی پھرتی ہے“

تند مزاج بہو بھلا ساس کی بات کیوں برداشت کرتی۔۔۔ جھٹ اُس کی زبان

چلنے لگی۔۔۔ ”تیرے بیٹے کی ہیں تو ڈال چوہے میں۔۔۔ میں پہنوں گی تو اپنے خصم کی پہنوں گی۔۔۔“

اس کے ساتھ ہی چوڑیاں چوہے میں ڈال دیں۔۔۔ اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ ایک اور تیر اپنے ترکش سے نکال کر گویا ہوئی۔۔۔

”یہ تم ہی بے شرم ہو کہ میرے خصم کا لایا ہوا ڈوپٹہ اوڑھے کھڑی ہو۔۔۔“

بہو کا یہ زہر میں بچھا فقرہ منکر ساس بھی تلملا اٹھی۔ اور اُس نے بھی ڈوپٹہ سر سے اتار کر چوہے میں جھونک دیا۔۔۔ اور کہا۔۔۔

”لے۔۔۔۔ تیرے خصم کا ہے تو ڈال اسے بھی چوہے میں میں اوڑھوں گی تو اپنے پوت کا لایا ہوا ہی اوڑھوں گی۔۔۔۔“

یہ ساری دُکھ بھری داستان سن کر انور کا تو چین و آرام ہی اُلٹ گیا۔۔۔ اور اُس کی رگ رگ میں درد بے قراری سرایت کر گئی۔

مسلل تین سال پردیس میں گزارنے کے بعد وطن واپس آ کر۔۔۔ والدین اور بیوی سے مل کر اُسے جو ایک روحانی خوشی میسر آئی تھی۔۔۔ اُس پر نیکسر پانی پھیر گیا۔ انور کا دمکتا چہرہ ایک دم اُداس پڑ گیا۔ اُس کے دل میں مچلتی اُمنگیں یکدم ساکت پڑ گئیں۔ حسرتیں گوشہ تنہائی میں ماتم کرنے لگیں۔ اُس نے عہد کر لیا کہ ایسے ناقدروں اور ناشکر گزاروں کو کسی طرح کا ہدیہ یا تحفہ دینا قطعی فضول ہے۔ اور پھر وہ پہلی فرصت میں نہ چاہنے کے باوجود مزید تین برسوں کے لئے کویت واپس چلا گیا۔

گردشِ دوراں

چودھری سمیع اللہ کا کافی لمبا چوڑا خاندان تھا۔ دُور دُور تک اِس آباد اور خوشحال گھرانے کا نام روشن تھا۔ لیکن نہ جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی کہ کچھ برسوں میں سرعت کے ساتھ حالات اِس قدر بدل گئے کہ اکثر عزیز و اقارب نے ہجرت کی راہ اپنائے پاکستان جانے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔ کچھ تو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور سمیع اللہ کے بڑے بھائی چودھری وسیم اللہ کا روبرو بار کے سلسلے میں سمندر پار مسقط میں فروکش ہو گئے۔ شادی وہاں ہی کی دو شیزہ سے رچا کر اپنوں سے ناطہ توڑ دیا۔۔۔ اب تو وسیع و عریض سہ منزلہ حویلی میں چودھری سمیع اللہ اپنی اکلوتی بیٹی حمیدہ اور بیوہ بہن کلثوم کے ہمراہ قیام پذیر ہیں۔ دو کنال بھرا احاطے میں حویلی کے بازو و عقب میں دو منزلہ کوارٹر تعمیر شدہ ہیں۔ ان کوارٹروں کے علاوہ حویلی کی پہلی و دوسری منزل میں دستیاب کمروں میں کرایہ دار ٹھہرائے گئے ہیں۔ البتہ پہلی اور دوسری منزل میں ٹھہرائے گئے کرایہ داروں کو احاطے کی باہری دیوار کے پاس لکڑی کی سیڑھی اُترنے چڑھنے کے لئے استعمال کرنی پڑتی تھی۔

ساجد بھی اپنی بیوہ ماں کے ساتھ حویلی کی پہلی منزل کے وسطی دو کمروں ورسوئی پر مشتمل فلیٹ میں ٹھہرے ہیں۔ حویلی کے احاطے میں دن اور رات دیر گئے تک ایک ہنگامہ و رونق کا سماں لگا رہتا۔ چودھری سمیع اللہ پیشہ سے ٹھیکہ دار ہیں اور بستی بھر میں وہ

چودھری کا کا کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن اپنوں کی صحبت حاصل نہ ہونے پر اُن کے مزاج میں چڑچڑاپن حد سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ معمولی سی بات پر غصے میں آکر اول فول بکنے لگتے ہیں۔ ویسے جان پہچان والوں کا کہنا ہے کہ رفیق حیات کی بے وقت موت کے باعث چودھری صاحب کے مزاج میں تلخی و ترشی سا گئی ہے۔ اُس نے غم غلط کرنے کی نیت سے شراب کا سہارا لیا جس کے باعث تلون مزاجی میں بلا کی شدت آنے لگی۔

ساجد محکمہ برقیات کے ضلع دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ دفتر میں کام کی زیادتی کی وجہ سے اُسے ہفتہ میں کچھ دن دفتری اوقات کے بعد بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ آج بھی ہیڈ کلرک چمن لعل کی شرکت میں پاور کنال کی مرمت کرنے کے سلسلے میں ٹینڈر نوٹس مرتب دینی تھی۔ اس لئے دیر سے فراغت پائی۔ سائیکل احاطے کی مشرقی دیوار سے ٹکا کے بالا خانہ کی سیڑھی سنبھل سنبھل کر چڑھنے لگا کیونکہ سیڑھی کے کچھ پائے شکستہ حالت میں تھے۔ ماں رسوئی کے باہر لکڑی کے تختے پر بیٹھی تھی۔ ساجد کو دیکھے اُس کے پڑمردہ چہرے پر اطمینان کے نقوش نمودار ہو گئے۔

”ساجد بیٹا اتنی دیر“

”کیا کروں ماں کام زیادہ تھا“

یہ کہتے ہوئے ساجد کمرے میں گھس گیا۔ فائیلوں کا پلندہ گوشہ راست میں پڑی تپائی پر رکھا۔ عینک اور گھڑی سامنے الماری کے اوپر جمادی اور خودتولیہ ہاتھ میں لئے غسل خانے کا رخ کیا۔ اُس کے نہا کے نکلتے وقت تک ماں نے حسب دستور لیموں کی شربت کا گلاس تیار کر کے تپائی پر رکھا۔ کپڑے بدل کے ساجد نے انگلیوں سے بال سنوارے کمرے کے عقب والی کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ پہلے ادھر ادھر جھانکا۔

اطمینان کرنے پر سامنے حویلی کی گیلری والی چٹن ایک طرف ہٹ گئی اور اندر بچہ سجائے کمرے میں چودھری صاحب کی لڑکی حمیدہ بجلی کی دودھیاروشنی میں کھڑی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ حمیدہ سے نظریں کیا نکرائیں ساجد کے چہرے پر اُن جانی رونق چھانے لگی۔

جاندار حسن کی تاب نہ لا کر وہ لجاجت کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔

تیپائی پر سے گلاس اٹھا کے کرسی پر بیٹھا اور شربت پینے لگا۔ حمیدہ اور ساجد کی تانک جھانک پچھلے کئی ہفتوں سے جاری ہے۔ وہ بس ایک دوسرے کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتے اور کچھ کہہ نہیں پاتے۔ اس تانک جھانک کی ابتداء اُس روز ہوئی تھی جب کچھ کرایہ داروں نے چودھری صاحب سے التجا کی تھی کہ ”لکڑی کی سیڑھی کے کچھ شکستہ زینے درست کرادے“

”سنجھل سنجھل کے زینے چڑھا کرو“ یہ چودھری صاحب کا جواب تھا۔

کسی ایک نے چھت کی مرمت کی بات چھیڑ دی۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے توں توں میں میں کی نوبت آ گئی

اس دوران حمیدہ اپنی تمام جلوہ نمایوں کے ساتھ نمودار ہو گئی

”ابا جان اندر چلئے، چھوٹے لوگوں کے منہ نہیں لگتے“

یہ کہہ کر حمیدہ چودھری صاحب کو حویلی کے اندر لے گئی۔ اور ساجد اوپر گیلری سے

سارا ماجرہ دیکھ سُن رہا تھا۔ حمیدہ کی چال ڈھال اور خدوخال کا جائزہ لئے ساجد دم بخود پڑ گیا۔

کرایہ داروں میں ایک ارشد میاں بھی تھے۔ اُس کی بابت مشہور ہے کہ کسی نیم

سرکاری ادارہ میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی اخبار ”روسیدا“ کا نامہ نگار بھی ہے۔

چودھری صاحب کو سنا تے ہوئے اونچی آواز میں چلایا۔

”کمال ہے صاحب! کرایہ ماہ بہ ماہ ادا کرنے کے بعد بھی چھت یا سیڑھی کی مرمت کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا جا رہا ہے۔ آخر کتنا برداشت کریں۔ اب تو یہ سب کچھ اخبار میں چھاپنا پڑے گا۔ خود ہی ہوش ٹھکانے آ جائیگے۔“

ارشاد چلتا پڑہ تھا۔ اُس کا یہ تیر خالی نہیں گیا۔ اگلے روز خلاف توقع چودھری صاحب ارشد کے کمرے میں آ گئے۔ ساتھ میں مستری رام دین تھا۔ اور نہایت حلیمی سے ارشد سے مرمت طلب امور کی بابت تفصیل دریافت کرنے لگے۔

ارشاد کیا بلکہ اُس پاس کے کرایہ دار چودھری صاحب کے اِس مروت بھرے لہجہ پر حیران تھے۔ رام دین کو سارا کام سمجھانے کے بعد چودھری حویلی کے صدر دروازہ کی جانب بڑھنے لگے تو ارشد کی زبان کام کر گئی

”بہت مہربانی چودھری صاحب! کوئی حکم ہو تو حاضر ہوں“

”ارے بیٹے ہم ایک دوسرے کے کام نہ آ جائیں تو کون آئے گا۔ اخبار میں کام کرتے ہو، دھیان رکھنا۔ ادھر ادھر کا کچھ چھپنے نہ پائے۔ فضول میں نام پر بیٹہ لگ جائے گا۔“

پھر کیا تھا۔ چھت، سیڑھی اور غسل خانوں کی مرمت کے ساتھ ساتھ ارشد کے دونوں کمروں کو رنگ و روغن سے نوازا گیا۔

اب تو معمول سا بن گیا تھا کہ دفتر سے آ کے ساجد کمرے کے عقب میں چھجے پر نمودار ہوتے تو حمیدہ کی زیارت نصیب ہوتی۔ دراصل حمیدہ کے شب باشی کے کمرے کی جنوب والی کھڑکی ساجد کی گیلری سے وابستہ تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اُلٹ بھری نظروں سے دیکھا کرتے۔

ارشاد نے ایک روز ان دونوں کی ٹانگ جھانک کو بھانپا اور پھر ساجد سے اس بابت تذکرہ چھیڑا۔ لیکن ساجد حد درجہ شریف تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی وجہ سے حمیدہ کی بدنامی ہو۔ اُس نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ صاف صاف بتا دیا کہ حمیدہ کے ساتھ اُس کا کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔

چھت پر نصب شدہ پانی کی مرکزی ٹینکی کی صفائی کرنی مقصود تھی۔ باتھ روم میں پانی آنا بند ہوا۔ مجبوراً دفتر سے واپسی پر ساجد کو احاطے والے نلکے کے پانی سے گھلی جگہ نہانا پڑا۔ اگرچہ شام کا خفیف اندھیرا پھیل چکا تھا پھر بھی اُسے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ نہا کے بنیان اور کچھانچوڑ رہا تھا کہ حوض کے قریب ہی ساجد کے سامنے کسی چیز میں لپٹا کاغذ کا ٹکڑا گر ا۔ اُس نے اوپر گیلری کی جانب دیکھا تو حمیدہ کو چحق کی اوٹ میں کھڑا پایا۔ دالان کی جانب دیکھا کہ کہیں ماں نہیں دیکھ رہی ہے۔ پھر ساجد جھکا اور صابن دانی کے ساتھ ساتھ کاغذ کے گولے کو اٹھایا۔

جلدی جلدی سیڑھی کے زینے طے کرنے لگا۔

”ماں نہانے میں مزہ آیا۔ موٹی دھار تھی پانی کی“

ساجد گیلا تو لے سکھانے کی خاطر رسی پر پھیلاتے ہوئے کہہ گیا۔

”کل سے تم صحن کے تل پر نہیں نہاؤ گئے اُس کی ماں نے کہا“

”کیوں ماں! کیا بات ہوئی“ ساجد نے حیران ہو کے پوچھا۔

”تم نہار ہے تھے اور چودھری کی بیٹی دیدے پھاڑ پھار کے تمہیں دیکھ رہی تھی“

”تو اُس سے کیا ہوتا ہے ماں“ ساجد نے جھپٹتے ہوئے کہہ دیا۔

”بیٹا نظر بد سے خدا بچائے، کھا جاتی ہے یہ انسان کو“

”نہیں ماں یہ سب کہنے کی باتیں ہیں“ یہ کہہ کے ساجد کمرے میں گھسا۔ کچھ دیر

اخبار پڑھنے میں گذرا اور پھر ماں کو باورچی خانے میں مصروف دیکھ کر ساجد نے گھبراہٹ

میں کاغذ کی گرہیں کھول دیں اور ٹیبل لیپ کی روشنی میں پڑھنے لگا۔

”گیلری میں لگی کھڑکی کا پٹ گھٹلا رکھنا۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں“

ساجد پسینہ پسینہ ہوا۔ گھبراہٹ میں اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سونے

سے قبل ساجد نے اطمینان کر لیا کہ گیلری والی کھڑکی بند کر دی گئی ہے۔ کمرے کی بتی بجھا کر

وہ بسترے میں لیٹے سوچنے لگا۔

”اگر کسی ایک نے حمیدہ کو دیکھا تو ساری عزت

خاک میں مل جائے گی۔ ماں بے چاری تو جیتے جی ہی

مر جائے گی۔ اور پھر چودھری صاحب جیسے نامی گرامی

شخص سے کسی طرح کا بیر لینا میری زیست کو ملایا میٹ

کر سکتا ہے۔“

ساجد نے بھانپ لیا کہ حمیدہ کا سایہ کھڑکی کے پاس چھجے پر سرک رہا تھا۔ اُس

نے دل پر پتھر رکھ کے لینے کی کوشش کی۔۔۔۔

اگلے روز دفتر سے واپس آئے تو ساجد نے ماں کو ڈھنگ کے کپڑے پہنے

”ساجد بیٹا تمہاری خالہ زیادہ بیمار ہے۔ میں اُس کے ہاں جا رہی ہوں۔ شاید رات وہاں ہی ٹھہرنا پڑے۔“
تمہاری چائے اور کھانا تیار کر کے رکھا ہے۔“

نہا کے اور کپڑے بدل کر ساجد نے چائے پی لی۔ اور غیر ارادی طور گیلری میں کھڑا خلاؤں میں گھورنے لگا کہ ڈالا میں لپٹنا کاغذ سامنے گرا۔ والا ان کی کھڑکی کے پاس حمیدہ انداز دگر میں جھانک رہی تھی کمرے میں آ کے ساجد نے کاغذ کھولا۔
”رات کو دس گیارہ کے درمیان میرا انتظار کرنا۔ چھجے والا پٹ گھولا رکھنا۔ ضروری بات کرنی ہے۔ خدا را میرے بھروسہ کا خون نہ کرو۔“

ساجد کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ماں گھر پر نہیں ہے۔ ورنہ کیا ہوتا۔ گھبراہٹ کے مارے ساجد کا بُرا حال تھا۔ دراصل شرافت اُس کی رگ رگ میں رس بس گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ حمیدہ آئے گی اگر کسی نے اُسے آتے دیکھا تو غضب ہوگا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔۔۔ کھانا کھا کے وہ جلدی بتی گل کئے بستر پر دراز ہوا۔ کچھ دیر بعد باہر گیلری میں آہٹ محسوس ہوئی۔ ساجد نے بھاری دل کے ساتھ افراتفری کے عالم میں کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ حمیدہ جھٹ سے کمرے میں گھس آئی۔ ساجد اُسے واپس جانے کے لئے کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ حلق سے باہر نہ آئے۔
”نایٹ لیمپ جلا دو“

حمیدہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا اور لمبا سانس لیا۔

ساجد کی حالت برابر سراسمگی سے لبریز۔۔۔۔۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔
 ”باہر سے میں آئی اور کپکپا تم رہے ہو“

حمیدہ نے پلنگ کے سر ہانے بیٹھ کے لحاف کا کونہ سرکاتے ہوئے کہا۔
 بدلے میں ساجد دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے تھر تھر کانپنے لگا۔ حمیدہ نے اُسے
 گھورتے ہوئے سرگوشیوں میں کہا۔

”ساجد اس حالت میں تمہاری ماں آجائے تو۔۔۔“

”ارے غضب ہوگا۔ تم تو بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ میں

ایک فلاش اور بیوہ ماں کا اکلوتا سہارا۔ ہمارے مائین

زمین آسمان کا فرق ہے۔۔۔ کہاں آسمان کی وسعتوں

میں دمکتا چاند اور کہاں اس لقا و دق صحرا کا ایک ادنیٰ زرہ“

بدلے میں شرارت آمیز تبسم حمیدہ کے چوڑے و سرخ ہونٹوں پر تھرکنے لگا۔ اُس
 نے بے تکلفی میں ساجد کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر زبان واک کی۔

”ارے تم تو تھر تھر کانپ رہے ہو۔ پہلے کسی لڑکی سے تنہائی میں نہیں ملے

ہو۔۔۔ تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میرے ابا آجائیں یا تمہاری ماں۔ تمہیں کوئی کچھ

نہیں کہے گا۔ کیونکہ میں اپنی مرضی سے از خود تمہارے کمرے میں آئی ہوں۔ یقین کر لو میں

تمہیں دل سے چاہتی ہوں۔ بے تحاشا پیار کرتی ہوں۔۔۔“

”نہیں حمیدہ جی“ ساجد بات کاٹتے بول اٹھا

”کہاں تم ایک درخشاں ستارا اور میری حیثیت موری

کے کیڑے سے کسی طور زیادہ نہیں۔۔۔ تمہارے پتا جی

کا نام ہے۔ مجھ سے پیار جتانے سے تمہیں کچھ بھی حاصل
 نہ ہوگا۔ ماسوائے پریشانی و کرب کے۔۔۔۔۔ چودھری
 صاحب تو زمین و آسمان ایک کر دیں گے۔۔۔ اور
 خدا خواستہ اگر چودھری صاحب یا اور کسی کا ہاتھ میرے
 گریباں کی طرف بڑھنے لگا تو میری ماں جیتے جی
 مرجائے گی۔ اُس کا اس بڑی دنیا میں میرے سوا اور کوئی
 نہیں۔“

اتنا کہہ کے ساجد حمیدہ کی جانب عاجزانہ نگاہوں سے گھورنے لگا۔
 ”ساجد! مجھے مایوس نہ کرو۔ ایک تم ہو کہ خاندان اور
 ماں کی خاطر میرے پیار کو ٹھکرانا چاہتے ہو اور ایک میں
 ہوں کہ تمہاری پناہ میں آنے کے لئے بڑی سے بڑی
 قربانی دینے کو تیار بیٹھی ہوں۔ مجھے اس طرح سے نہ
 ٹھکراؤ کہ کہیں کی نہ رہ جاؤں۔۔۔ ارشد تو اُبو کے بڑے
 چہیتے بنے پھرتے ہیں۔ وہ اُس کے ساتھ شطرنج کھیلا
 کرتے ہیں اور رات دیر گئے تک اکٹھے شراب پیا کرتے
 ہیں۔ اُس بد معاش نے بسا اوقات مجھے شیشے میں
 اتارنے کی کوشش کی لیکن میں اُس کی غرض بھری چاہت
 کو پائے حقارت سے ٹھکراتی آئی ہوں۔۔۔۔۔ اُس شرابی
 کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ تمہارے ساتھ گھر سے

بھاگنے کو بھی تیار ہوں۔“

اتنا سننے کے بعد بھی شرافت کا پتلا ساجد جس سے مس نہ ہوا۔ گو وہ حمیدہ کو دل سے چاہتا تھا لیکن لوک لاج کا زیادہ خیال تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی معمولی سے لغزش کے باعث اُس کی ماں کا سر نیچا ہو۔ یا اُسے کسی طرح کے طعنے سننے پڑیں۔۔۔۔۔ عاجزانہ انداز اپناتے ہوئے گویا ہوئے۔

”مجھے معاف کر دو حمیدہ! گو میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں لیکن ایسی کسی حرکت کا مُرتکب نہیں ہونا چاہتا جس کے باعث میری ماں کو تکلیف یا پریشانی سے دوچار ہونا پڑے۔ میں تو ماں کی خوشی کی خاطر مر مٹنے کو تیار ہوں۔۔۔۔۔ تمہیں گھر سے بھاگ کر لے جانے کی بابت میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ محبت ایک پاک جذبے کا نام ہے ہوس پرستی یا جذبات کی رو میں بہنے کا نام محبت نہیں۔“

اتنا کچھ سننے کے بعد حمیدہ کی حالت غیر ہو گئی۔ اُس کے بشاش چہرے پر مایوسی و اُداسی کے نقوش واضح طور اُبھرنے لگے۔ کچھ کہے بغیر وہ گیلری کی جانب بڑھنے لگی اور کھڑکی پھلانگ شبِ باشی کے کمرے میں گھس گئی۔ ساجد کھڑکی بند کرنے اُٹھے تو اُس کی نظر احاطے کے بائیں جانب لکڑی کے ٹال کے مالک آفاق خان کے بیٹے نعیم خان پر پڑی جو مدھم آواز میں رباب بجا رہا تھا اُسے لگا کہ نعیم خان نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

ساجد کی نیند غائب! کبھی حمیدہ کی بابت سوچنا اور کبھی اس خیال سے کہ پٹھان

کے بچے نعیم نے اُسے حمیدہ کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ کہیں وہ چودھری صاحب یا اُس کی ماں کو نہ بتائے۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے ذہن میں ابھرنے لگے اور سر اسیمگی کی حالت میں یہ بھلا کی رات اُس نے آنکھوں آنکھوں میں کاٹ لی۔

اگلے روز دفتر سے واپس آنے پر ساجد نے ماں کے رویے میں کسی طرح کی تبدیلی نہ پا کے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد کمرے کی کھڑکی کا پٹ کھولے جھانکنا شروع کیا۔ مخصوص جگہ پر دبیز پردہ پڑا تھا۔ اور دالان والی کھڑکی بھی خلاف معمول بند پڑی تھی۔

دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں گذر گئے۔ ساجد اندر ہی اندر اپنے آپ کو کوٹھنے لگا۔ اب نہ ہی سامنے والی چٹائی اور نہ ہی حمیدہ نے اُسے نظر بھر دیکھنے کی سعی کی۔ ساجد پہروں دالان پر گذرتا لیکن حمیدہ کی جھلک دکھائی نہ دی۔ جیسے حمیدہ کہیں چلی گئی ہو۔ اب ساجد کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش میں نے حمیدہ کے بے لوث پیار کا جواب پیار سے دیا ہوتا۔ تو یہ افسردہ ایام نہ دیکھنے ملتے۔

اگلی صبح احاطے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ساجد نے گھبرا کے لحاف ایک طرف پھینکے ماں کو جگایا۔۔۔ پانی کے حوض کے پاس چودھری صاحب منہ کے بل گر پڑے تھے۔ لوگ اُسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حمیدہ کی پھوپھی کا بُرا حال تھا۔ بھائی کی پگڑی کی گرد جاڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ساجد اور اُس کی ماں حقیقت حال سے باخبر ہو جانے کی خاطر نیچے آگئے۔ ارشد بڑی شان سے کہہ رہے تھے۔

”آخری زمانہ ہے۔ صاحب۔ یہ حوازا دیاں تو اپنے

عیش کی خاطر خاندان کی عزت کا نیلام کرنے سے بھی

گزیں نہیں کرتیں۔ حمیدہ زیورات و نقدی گھر سے لئے

بھاگ گئی ہے۔ اور وہ بھی پٹھان بچہ نعیم خان کے ساتھ۔“

ساجد کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اُسے لگا کہ اُس کے وجود کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا گیا ہو۔

اتنے میں چودھری صاحب ہوش میں آگئے اور لوگ اُسے حویلی کے اندر لینے لگے۔ اُس کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ ساجد کی ماں نے حمیدہ کی پھوپھی کو سہارا دیا۔ وہ اُسے دلا سہ دینے لگی۔

”بہن خدا پر بھروسہ رکھ، ویسے جوان ہوتے ہی لڑکی

کی شادی کرنی چاہیے۔۔۔۔۔“

اس پر حمیدہ کی پھوپھی نے زور دکر کہا

”بہن! بھائی صاحب کے کہنے پر میں حمیدہ اور ساجد

کا رشتہ طے کرنے آپ سے ملنے ہی والی تھی کہ یہ حادثہ

ہوا“

ساجد نے سب کچھ سُن لیا۔ اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ اپنی تیرہ بختی پر ماتم کرنے لگا۔ کاش میں اتنا ڈر پوک نہ ہوتا۔ کاش میں نے حمیدہ کی محبت کا جواب محبت سے دیا ہوتا۔ کمرے میں گھس کر وہ بچوں کی طرح ٹھاٹھا کر رونے لگا۔

اگلے روز غیر ارادی طور ساجد نے گیلری والی کھڑکی کے پیٹ کھول دئے۔ سامنے کاغذ میں لپٹا مٹی کا ڈلا پڑا تھا۔ نمرت کیساتھ کھڑکی پھلانگ کے ڈھیلا اٹھا لیا۔۔۔ اور کمرے میں گھس حمیدہ کے خط کی گدازیوں میں جھانکنے لگا۔

”ساجد صاحب۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔“

اب میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری اس بے وفائگری سے جا رہی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ میں کتنی بدنصیب ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہا اور خوش تھی کہ من پسند ساتھی کے ساتھ میری زندگی سکون سے گزرے گی۔ لیکن خدائے برحق کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کاش تم اتنے وفا شناس، فرمانبردار اور ڈرپوک نہ ہوتے۔۔۔۔۔ ارشد کینے نے موقع کا فائدہ اٹھائے ابو کے ساتھ رابطہ بڑھا دیا۔ دونوں ایک ساتھ شراب پیتے۔۔۔ ایک رات جبکہ میری پھوپھی کی طبیعت ناساز تھی۔ ابو کو ارشد نے زیادہ مقدار میں شراب پلا دی۔۔۔۔۔ ابو وہی پلنگ پر ڈھیر ہو گئے اور ارشد نے مکارانہ انداز اپنائے میرے کمرے کا رخ کیا۔ گو میں نے مزاحمت سے کام لیا۔ لیکن حالات اس قدر نامواقف تھے کہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی میں اپنے وجود کو بدنامی کے دلدل بھرے کھڈ میں جا گرنے سے نہ بچا سکی۔ بربادی کی چادر اوڑھے میں نے چاہا کہ اب ارشد کو ہی رفیق زندگی کے طور پر جن لوں۔ لیکن یہ اصلیت جان کے کہ وہ نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ دو بچوں کے باپ بھی ہیں میرے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈور کٹی پتنگ کی صورت میں خلاؤں میں ہچکولے کھانے لگی۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

اپنے آپ کو میں اس دھرتی کا بوجھ سمجھنے لگی۔۔۔ عین اُس وقت جبکہ میں اپنے وجود کو مٹانے کی نیت سے احاطہ والے کنویں میں کودنا چاہتی تھی نعیم خان نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا۔ حالانکہ میں اُسے ایک موالی غنڈہ جان کے نفرت کرتی تھی۔ لیکن بخدا وہ پٹھان بچہ ہمت والا نکلا۔ اُس کا بروقت دست تعاون دراز کرنے سے کم از کم میرے پیٹ میں پلنے والے بچے کو باپ کا نام تو مل جائے گا۔ میں نے نعیم خان کے ساتھ بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کاش تم اس قدر شریف و ڈرپوک نہ ہوتے آپ شاید مجھے اس سب کے لئے قصور وار ٹھہراتے ہوں لیکن میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہراتی۔ شاید یہی ہمارا مقدر تھا۔۔۔ انسان بے بس ہے۔ کیا چاہتا ہے اور کیا ہوتا ہے دراصل ہم سب گردشِ دوراں کے آگے بے بس ولا چار ہے۔۔۔

خدا حافظ

فقط غم زدہ حمیدہ

☆☆☆☆☆

☆☆☆

☆

افسانے

انتظار

برسوں سے مفلسی و تنگ دستی کی مار سہتے سہتے اب ہم تھک چکے ہیں۔ گو میرے ساتھ ساتھ میرے ابو اور امی نے بھی ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن جی تو زحمت کے بدلے میں حاصل کردہ رقم کا بڑا حصہ دادا جی کے علاج و معالجہ پر ہی صرف ہوتا اور ہمیں دو وقت کی دال روٹی بھی بہ مشکل میسر تھتی تھی۔

چھوٹے بہن بھائی کو اچھی تعلیم دینا تو درکنار ڈھنگ کا لباس بھی پہننے کو نہیں ملتا۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ انسان کا مقدر اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور ہم نے بھی تک ہار کر اپنی قسمت بدلنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ کچھ مدت چارپائی پر براجمان ایڑیاں رگڑنے اور ملک الموت کو سدایا کرتے چواری (۸۴) سالہ دادا جی بھی بہ خوشی راضی ہو گئے۔ اس منصوبے کو رو بہ عمل لانے سے جہاں دادا جی کو برسوں کی اذیت سے سدا کے لئے چھٹکارا مل جائے گا ہمیں سرکار سے دو لاکھ روپے نقد حاصل ہونگے۔

بس اب اگلے دن گئے کاشت کے ساتھ انتظار ہے۔

بیدار مغز

پُر آشوب حالات کے زیر اثر ایک مذہبی رہنما کو کسی غنڈے نے علی الصباح گھر کے باہر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ رد عمل کے طور اگلے روز کچھ نامعلوم نقاب پوش بندوق برداروں نے مقامی مسجد میں نماز مغربین ادا کرنے والوں پر اندھا دھند گولیاں برساکر درجن بھر افراد کو داکئی نیند سلا دیا۔

ان دو جانکاہ واقعات کے بعد کشیدگی اور آپسی کدورت میں نہایت اضافہ ہوا۔ خوف و ہراس بستی کی ہر گلی میں راج کرنے لگا اور بے اعتمادی کی فضا ہر گھر انے میں ہاتھ پاؤں پھیلانے میں کامیاب نظر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب تک ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والوں نے نفرت و دشمنی کی راہ پر گامزن ہونے میں ہی اپنی عافیت جان لی۔ الغرض ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک مذہب ایک قرآن اور ایک قبلہ کو ماننے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔

اسی دوران سلامت گلی کے ککڑ پر ہاتھ میں چھری لئے ایک نوجوان نے آنکھیں پیلی کر کے ایک لاغر شخص کو روک کر غصے سے پوچھا

”ارے بوڑھے سچ بتاؤ، سنی ہو یا شیعہ؟“

معمّر شخص نے قدرے توقف کے بعد اطمینان کے ساتھ خنجر بردار کا جائزہ لیا اور

تھر تھراتی ہوئی آواز میں کہا:

”بیٹے میں سنی ہوں نہ شیعہ بلکہ خدائے برحق و برتر
کے فضل و کرم سے ایک مسلمان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے
پسندیدہ دین اسلام کا پیروکار اور آخری پیغمبر
محمد مصطفیٰ ﷺ کا اُمتی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس
کے بعد بھی اگر میرا خون بہانے سے تمہیں کسی طرح کی
راحت مل سکتی ہے تو لو، میرا سینہ حاضر ہے۔“

نوجوان گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا۔ ماتھے پر اُبھری غصے
کی سلوٹیں ایک ایک کر کے غائب ہو گئیں اور آنکھوں میں ندامت کے نقوش واضح انداز
میں اُبھرنے لگے۔ پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور
خنجر اپنے ہی سینے میں پیوست کر دیا۔



مین ہول

رات سرد اور تاریک تھی

کہرے کی وجہ سے اندھیرا چھایا تھا

اکرم نے ادھر ادھر جھانک کر اطمینان کیا اور ”مین ہول“ پر رکھے وزنی ڈھکن کو جدوجہد کے بعد اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ ڈھکن کو احتیاط کے ساتھ سائیکل کے کیریر کے ساتھ باندھا اور چل پڑا۔ سیٹھ رزاق کے کارخانے کے قریب رُک گیا۔ کارخانے میں کام چل رہا تھا۔ اکرم کو رقم ملی اور ڈھکن کو دھکتی ہوئی بھٹی میں ڈالا گیا۔

دوپگ حلق پر انڈیلے اکرم گھر لوٹا

دیر تک سوتا رہا

لوگوں کی چیخ پکار نے اُسے جگا دیا۔

لوگ بدحواس ہو کر بڑی سڑک کی طرف دوڑ رہے تھے

”ارے کیا ہوا؟“ اکرم نے بھاگتے ہوئے جوان کا ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔

”تم۔۔۔۔۔ تمہیں۔۔۔۔۔ تمہیں نہیں معلوم چاچا“۔ نو جوان نے حیرانی کے

عالم میں کہا۔

”اکرم چاچا رات کو کسی کمینے نے بڑی سڑک کے مین ہول کا ڈھکن چُرایا ہے۔

تمہارا بیٹا و سیم اسکول جاتے ہوئے اُس میں گر گیا۔“

وفا پرستی

شام کے گھرے، تاریک اور تلکے سائے پھیلنے لگے، گاؤں سے دور پہاڑی کے دامن میں واقع کھلیان کی کچی اینٹوں کی شکستہ دیوار کی آڑ میں گھنی جھاڑیوں کے پاس دو انسانی پیکر نمودار ہوئے اور دم سکت فضا میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔

”اونہہ“

”ہاں“

”سن رہے ہو انور۔۔۔۔۔“

”نہیں! اس وقت میں مدہوش ہوں“

”آخر ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے۔“

”جب تک قسمت ساتھ دے“

”انور! خدا را کبھی تو سنجیدگی کا مظاہرہ کیا کرو۔“

”کون احمق سنجیدہ نہیں۔ البتہ چاہتا ہوں کہ ان خوشگوار

گھڑیوں میں فقط پیار و محبت کی باتیں کریں۔“

”دیکھو نا بستی سے دور اور گھر والوں سے چوری مجھے

اس طرح کا ارتباط بڑھانا اچھا نہیں۔ آخر تم اپنے والدین

ناہیدہ کے گھر والوں پر غم و بدنامی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک جانب والدین و اقرباء بدنامی و شرمساری کا ہدف بنے ناہیدہ کے بے جان جسم کی تجہیز و تکفین کا اہتمام کرنے لگے اور دوسری طرف آس پڑوس کے لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے میں لگن تھے۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ غرض ناہیدہ کے والدین کو ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس غم زدہ اور طعنہ زنی سے لبریز ماحول میں انور کی بھاری بھر کم آواز نمایاں طور پر گونج رہی تھی۔

”حد ہو گئی! از دو اجی رشتے سے دامن بچائے اس صدی کی خاتون نے عیاشی کی زندگی گزارنا اپنا ایمان جان لیا ہے۔ شرم و حیا کے پیراہن تار تار کئے حالیہ زمانہ کی حوازا دی بازار حسن کی رونق بننے میں فخر محسوس کرے گی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی کدورت و بے اعتمادی کے کالے بادل آسمان کی وسعتوں میں ادھر ادھر غیر ارادی طور پر پھیلنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وفا پرستی اور وشواس جیسے الفاظ بے وفائی کے لمبے چوڑے صحرا میں اپنی وقعت کھونے لگے۔



وقت وقت کی بات

ہماری رہائش گاہ کے بغل میں شہر کے مشہور وکیل ریاض راٹھور قیام پذیر ہیں۔ دونوں گھرانوں کے مراسم بہت ہی خوشگوار چل رہے ہیں۔ جب بھی ان کو یا مجھے ذاتی یا دیگر مصروفیات سے فراغت ملتی ہے تو ایک دوسرے کی صحبت اپنائے سیاسی سماجی مذہبی یا ادبی مسائل پر تبصرہ آرائی کرنے کے دل کا غبار ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایتوار کو ناشتہ کرنے کے بعد میرے قدم ریاض منزل کی جانب چل پڑے۔ راٹھور صاحب برآمدے میں ہی آرام کرسی پر براجمان تھے اور ان کے روبرو ایک کچم شحم خاتون اپنی روئداد سنار ہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد مجھے بازو والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور ساتھ ہی خاتون سے مخاطب ہوئے۔

”دو سال سے معاملہ عدالت کے زیر غور ہے۔ تم چاہو تو طلاق حاصل کرنے کے لئے اب کارروائی کی جاسکتی ہے“

یہ سننا تھا کہ خاتون کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور زبان وا کر دی۔
 ”نہیں راٹھور صاحب میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں میں طلاق نہیں چاہتی بلکہ میری خواہش ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں وہ میری زیرست سے وابستہ رہے۔ میں ان کو یہ احساس دلانا چاہتی ہوں کہ عورت مرد کی لونڈی نہیں بلکہ شریک حیات ہوا

کرتی ہے۔ عورت کو مرد کی جوتی سمجھنے والے ایسے گمراہ افراد کو سزا
ملتی ہی چاہئے۔ میری خواہش ہے کہ انور صاحب مقدمہ بازی
میں الجھا رہے تاکہ دوسری شادی نہ کر سکے۔ بس میں یہی چاہتی
ہوں۔“

غرضیکہ نئی باتیں کر کے خاتون شان بے نیازی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی
اور چلنے سے قبل اپنی بند مٹھی ریاض کے ہاتھ میں خالی کر دی۔ غالباً وہ اور بھی بہت کچھ کہنا
چاہتی تھی لیکن میری موجودگی کے احساس نے اُسے چلنے پر مجبور کیا تھا۔

ریاض سے پوچھنے پر اس معاملہ میں مزید جانکاری اس طرح کی ملی کہ رفیقہ بیگم
مقامی گزلز کالج میں لیکچرار کے فرائض ادا کر رہی ہے۔ اور اسکے خاوند منصور احمد محکمہ تعمیرات
کے اے کلاس ٹھیکیدار ہیں۔ برسوں سے بدگمانی کا ہدف بنے الگ الگ زندگی گزار رہے
ہیں۔ اور ان کے موجودہ تعلقات نہایت ہی کشیدہ چل رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے میں
سوچنے لگا کہ ایک متمول اور پڑھے لکھے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی ازدواجی
زندگی میں بھی اُنار کی سما سکتی ہے۔ کہانی کار ہوں اس لئے رفیقہ و منصور کے باہمی معاملے
میں دلچسپی لینے لگا۔ جدا ہوتے ہوئے میں نے ریاض سے تاکید کی کہ اس بابت آئندہ
روئما ہونے والے واقعات سے مجھے آگاہ کریں۔

وقت گزرتا گیا اور میرے ذہن سے رفیقہ کے معاملے کے نقوش مدہم ہونے
لگے تھے کہ ایک شام جبکہ میں قرۃ العین حیدر کے ”کارِ جہاں دراز ہے“ کی ورق گردانی
کرنے میں محو تھا ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ آواز ریاض کی تھی۔
”ارے احمد کیا بات ہے تین روز سے ملے نہیں۔“

اس وقت یاد کیسے کیا۔ خیریت تو ہے“ میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھ لیا۔

”گھبرانے کی بات نہیں۔ دراصل رفیقہ والے

معاملے نے عجیب کروٹ لے لی۔ اس کے خاوند نے

عدالت کے حکم کو ٹھکراتے ہوئے دوسری شادی کر لی

ہے۔

”پھر تو اسے ضرور سزا ہوگی۔ اور رفیقہ کو بھی انتقام

لینے کا اچھا موقع مل گیا ہے“

میرے دل میں رفیقہ بیگم کے لئے ہمدردی کے سوتے اُبلنے لگے کہ ریاض کی

آواز گونجی۔

”لیکن احمد وہ تو اب کیس لڑنا نہیں چاہتی“

”آخر کیوں؟“ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

”منصور صاحب نے دوسری شادی رفیقہ کی چھوٹی بہن قدیرہ سے رچائی ہے۔



بازو بند

ہر طرف اندھیرے کا خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چھوٹی لائین کی مسافر ٹرین جالندھر اسٹیشن سے جموں اسٹیشن کے لئے تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔

بیشتر مسافر نیند کی آغوش میں خراٹے بھر رہے تھے۔ ٹھکان کوٹ اور کھٹوند کے درمیان غیر آباد علاقے سے گذرتے وقت اچانک ایک جنگلی سانڈ مسافر ٹرین کے سامنے نمودار ہوا۔ سانڈ کے ٹکڑے ہو گئے البتہ ریل گاڑی کے زیادہ تر ڈبے الٹ گئے اور گہری کھائی میں گر گئے۔

دلخراش حادثہ کے ساتھ دل ہلا دینے والی چیخ و پکار خاموش فضا میں گونجنے لگی۔ زخمی لوگوں کی آہ و بکا نے قیامت کا سماں پیدا کیا۔ زیادہ تر مسافر ڈبے خندق میں گرنے کے ساتھ ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

پاس والی پہاڑی بستی سانجوان کے کچھ لوگ جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ کچھ لوگ زخمی سوار یوں کو سہارا دینے لگے۔ البتہ کچھ افراد انسانیت و مروت کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے مردہ عورتوں کے جسم سے زیورات اُتارنے لگے۔ اُن میں گرچرن سنگھ بھی تھا۔ گلاس فیکٹری میں ادنیٰ ملازم اور نہایت ہی پریشان حال، اکلوتا بیٹا کلونت کچھ دنوں سے بیمار پڑا ہے۔ افاقہ نہیں ہو رہا ہے۔ درکار رقم دستیاب نہ ہونے کے باعث کسی اچھے ڈاکٹر کو نہیں دکھا سکتا۔

گورچرن بھی کچھ زیورات اُتارنے میں کامیاب ہوا۔ گھر واپسی کی سوچ رہا تھا کہ اُس کی نظر خفیف روشنی میں اوندھے منہ گری خاتون کی لاش کے بازو بند پر پڑی۔ اُس

نے تذبذب کی حالت میں بازو بند کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔۔۔ اتنے میں پاس ہی لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ گورچن نے کمر سے لٹکی کٹاری نکال کے خاتون کا بازو کندھے سے اگل کر دیا اور کڑتہ میں جھپٹا گھر کی جانب دوڑ پڑا۔

گھر کے پچھواڑے میں بازو بند کھول کے بازو سامنے بہتی ندی میں پھینک دیا۔
زیورات کی پوٹلی اپنی پتی جانکی کور کے ہاتھوں میں تھما دی۔
”یہ کیا ہے کلونت کے باپو؟“

”ارے گور و نانک کو دراصل ہماری حالت پر رحم آیا۔

یہ سونے کے زیورات ہیں۔ اندر چھپا کے رکھو۔“

”پر یہ آئے کہاں سے۔ سچ بتاؤ۔ معاملہ کیا ہے کہیں چوری۔۔۔۔۔“

”زبان کو لگام دو جانکی۔ ارے چوری نہیں کی بلکہ

جگ کے داتا ہم پر مہربان ہوئے ہیں۔ میں تو تمہیں آج

تک سونے کی مُندری نہ دے سکا۔ اب ارمان نکال دو۔

اور پھر کلونت کا علاج بھی ڈھنگ سے کرائیے،

گور چرن بات کاٹے کہہ گیا۔

پانی کا گلاس حلق پر انڈیلے گورچن بستر پر دراز ہوا اس اُس طرح کے خیالات اُس کے ذہنی وسعتوں میں ابھرنے اور ستانے لگے۔

اگلے روز سویرے ہی دروازہ پر دستک ہوئی جانکی نے دروازہ کھولا۔ پولیس والے کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

”گورچن سنگھ کہاں ہے؟“

”آواز سُتے ہی گور چرن ایک مجرم کی طرح پولیس والے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی حالت نہایت اتر ہونے لگی۔

”کرپال کو تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”صاحب وہ میری بڑی بہن ہے جالندھر میں رہتی ہے خیر تو ہے؟“ گور چرن نے پریشانی کی حالت میں دریافت کیا۔

”اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ کل رات ریل حادثے کا شکار بن گئی۔“

پولیس والے نے گور چرن سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی جتائی۔

”اُس کی جیب سے تمہارا تحریر کردہ خط ملا ہے کچھ دن

قبل ہی تم نے پوسٹ کیا تھا۔“

گور چرن رنج و غم کا مجسمہ بن گیا۔ وہ بھیگی پلکیں رومال سے صاف کرنے لگا۔

اتنے میں پولیس والے نے نہایت ہی عاجزانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا

”حوصلہ رکھو گور چرن بھائی۔ سانجوان پولیس چوکی

میں تمہاری بہن کی لاش پڑی ہے۔ لے جانا۔ البتہ ڈکھ

کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ کسی وحشی درندے نے بڑی

بے رحمی کے ساتھ اُس کا بایاں بازو کاٹ لیا ہے“

یہ سُنتا تھا کہ گور چرن بچوں کی طرح ڈاڑھیں مار کر رُونے لگا اور بے تحاشہ ندی

کی جانب دوڑ پڑا۔ جانکی کور بے حس و حرکت زیورات کی پوٹلی کو اندازِ دگر میں گھوڑنے لگی۔



خواب و خیال

اپنی تو عادت ٹھہری کہ جب تک کہانی یا واردات کے کردار سامنے منڈلانے نہ لگے قلم و قراطس کا سہارا لے ہی نہیں سکتا۔ ویسے عادتاً زیادہ تر رات کو بستر میں لیٹتے وقت دن بھر کے واقعات ذہن میں ریگنے لگتے ہیں۔

سنچر کی رات اس خیال سے کہ کل ایت وار کو چھٹی ہے
دیر تک کاغذ و اعداد کرتا رہا

رات جوان ہونے لگی اور مجھے نیند نے آگھیرا۔ کاغذ قلم سامنے ٹی پائے پر رکھ کر
میں نے بیڈ سوچ آف کر دیا۔

----- بے خودی کے عالم میں بیوی کے گلے کا بگل گھر کی وسعتوں میں
گو نجنے لگا۔

”سنتے ہو! میری طبیعت ٹھیک نہیں کم از کم آج بازار سے
سبزی روٹی خرید کے لاؤ“

چارونا چار بستر سے اٹھا، غسل خانے سے فارغ ہوئے پرانا تھیلہ کا بندھے پر
لٹکائے گھر سے چل پڑا۔

بڑے چوک میں مندر کے پاس لوگوں کی بھیڑ تھی۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ
آپس میں گھس گھس کر رہے ہیں۔ میں نے آگے جا کے ایک شخص سے پوچھا۔
”کیوں بیٹے کیا بات ہے“

”چاچا مندر کا تجارتی کل رات اپنے دوستا تھیوں

سمیت مندر کے احاطے میں شراب پیتے پکڑا گیا۔ اب
یہ لوگ تھانے سے بخاری کو چھڑانے کی بابت تبادلہ خیال
کر رہے ہیں۔“

آگے بڑھتا گیا۔ عید گاہ کے نکل پر کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں بھی نزدیک گیا۔
پتہ چلا کہ مولوی صاحب مسجد میں نماز پڑھانے کے ساتھ ساتھ مکتب میں بچوں اور بچیوں کو
قرآن شریف کا درس بھی دیتے ہیں اُسے مکتب میں زیر تعلیم نابالغ لڑکی سے دست درازی
کرتے پکڑا گیا۔

ذہنی تناؤ کا ہدف بنے میں سبزی منڈی کی جانب چل پڑا۔ ابھی کچھ قدم ہی چلا
تھا کہ کانوں میں ایک سریلی آواز پڑی۔

”وہ حسینہ فیلم پری۔ کرگئی کیسی جادوگری“

سامنے گیا تو ایک لڑکا شان کے ساتھ فلمی گانے سن رہا تھا اور لوگ محظوظ ہو رہے تھے۔

”کیوں برخوردار کتنی جماعت میں پڑھتے ہو؟“ میں نے پہل کی

”پانچویں کلاس میں پڑھتا ہوں“ لڑکے نے جواب دیا۔

”ہاں تو یہ بتاؤ ہمارے ملک کے صدر کا کیا نام ہے“

”من موہن سنگھ“ لڑکا بے تامل کہہ گیا۔

”اچھا ہمارا قومی ترانہ کون سا ہے؟“

”سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا“

لوگ قہقہے لگانے لگے

”ہمارا قومی پرندہ کون سا ہے“

”ارے بابو جی مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ فلمی دنیا کی بابت
سوال کرو، فلمی ناموں کے ساتھ ساتھ ہیرو ہیروئن کے
نام ازبر ہیں“

میں آگے بڑھا اور سوچتا رہا جس دلش کے بچے اتنے ذہین ہوں اُس دلش کا
مستقبل کتنا شاندار ہوگا۔

سبزی منڈی میں ایک ہنگامہ مچا تھا
”کرپا کر کے دروازہ کھولئے“۔۔۔ کرپا کر کے دروازہ کھولئے“
صدر دروازہ پر نصب کال بیل کی آواز نے مجھے نیند سے بیدار کیا۔ آنکھیں ملتا ہوا
اُٹھا کہ شریک حیات کی آواز گونجی

”خدا رادو دھ میں پانی نہ ملایا کرو۔ دیکھو کتنا پتلا دودھ ہے۔“
”بہن جی میں دودھ میں پانی نہیں بلکہ پانی میں دودھ
ملا لیتا ہوں، مجبور ہوں، بیس روپے کلو میں خالص دودھ
ملے گا۔ سولہ روپے میں ایسا ہی ملے گا۔“

میں تولیہ، صابون دانی اور دانتوں کا برش لئے غسل خانہ میں گھس ہی رہا تھا کہ
بیوی کی آواز نے چونکا دیا۔

”سُنئے ہو جی! آج میری طبیعت ناساز چل رہی ہے
کم از کم بازار سے سبزی و روٹی لے آؤ۔“



نیا سویرا

پرویز ایک خوش خال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد عطا اللہ خان محکمہ مال میں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ ماں فریدہ جی مقامی گزٹنگ کالج میں ٹیچر تھیں۔ والدین اور چھوٹے بھائی عقیل کی صحبت میں پرویز کا بچپن ولولہ کن خوشیوں اور راحتوں سے بسر ہوا۔ اُس کی ہر چھوٹی بڑی فرمائش پوری کی جاتی۔ لیکن نہ جانے کس بدخواہ کی نظر لگ گئی کہ اچانک مایوسی و تیرہ بختی کے سیاہ بادل پرویز کی بسی بستی اور آباد نگری کی وسعتوں میں پھیلنے لگے۔ عین اُس وقت جبکہ پرویز نے گریجویشن اور عقیل نے میٹرک کے اہم امتحانات امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کر دیئے اور وہ دونوں آئندہ کے تعلیمی منصوبوں پر والدین و احباب کے ساتھ صلاح مشورہ کر رہے تھے ایک دلخراش حادثہ وقوع پذیر ہوا۔

عطا اللہ خان نوکری سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ بینک کی مقامی شاخ سے پنشن کی رقم وصول کر کے گھر کی جانب اپنی گاڑی میں آرہے تھے کہ انیلم چوک کے ٹکڑ پر گرینڈ زور وارد ہمارے کے ساتھ پھٹ گیا۔ گرینڈ کے آہنی ریزوں سے آس پاس کے درجن بھر افراد شدید طور زخمی ہوئے جن میں سے تین افراد زخموں کی تاب نہ لا کر ہسپتال میں دم توڑ بیٹھے اُن میں عطا اللہ خان بھی شامل تھا۔ رفیق حیات کی بے وقت دائمی جدائی کے بعد فریدہ کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی۔ جیسے جیسے کی خواہش اُسے چھین لی گئی ہو۔ فیملی ڈاکٹر تو ریراشد نے بغور جائزہ لیا اور اس اصلیت کا انکشاف ہوا کہ دل کے عارضہ نے فریدہ جی کو اپنے چنگل میں لے رکھا ہے۔ نامی گرامی ڈاکٹروں سے علاج کرانے کی غرض سے پرویز نے ماں کو دہلی و بمبئی لے لیا۔ البتہ افاقہ نہ ہوا۔ اور خلاف توقع جبکہ مسجد سے صبح اذان کی آواز

بلند ہو رہی تھی۔ پرویز اور عقیل کو روتا پلکتا چھوڑ اس عارضی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطق توڑ گئی۔ دراصل رفیق زندگی کی دائمی جدائی کا غم فریدہ جی برداشت نہ کر پائی۔

والدین کی جدائی کے بعد پرویز اور عقیل کی دنیا میں گھور اندھیرا چھا گیا۔ اُن کی ہمت ٹوٹ سی گئی۔۔۔۔ اور اپنی بد بختی پر روتے رہے۔

ایک روز عقیل کالج کے لئے گھر سے چل پڑا۔ شام تک واپس نہیں آیا۔ ڈھونڈنے پر پرویز کو یہ جانکاری ملی کہ عقیل کالج نہیں گئے تھے۔۔۔۔ پُر آشوب حالات میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ کسی نے کہا فورسز نے حراست میں لیا ہوگا۔ کوئی بولا سرحد پار کر لی ہوگی۔

پرویز نے پولیس، حفاظتی دستوں، تحریکی و عسکری ٹھکانوں سے رابطہ قائم کیا لیکن بے سود۔ پرویز کی رہی سہی امیدیں دم توڑ بیٹھیں۔

دن گزرتے گئے۔ کسی نے پرویز سے کہا کہ عقیل کو بانڈی پورہ میں دیکھا گیا ہے۔ وقت ضائع کئے بغیر پرویز وہاں چلا گیا۔ لیکن ماسوائے مایوسی کے کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔

تھک ہار کر پرویز پہاڑی کے دامن میں سڑک کے کنارے چائے خانہ میں داخل ہوا۔ گوشہ راست میں خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”کیا چاہئے صاحب؟“

پرویز کے سامنے عقیل کی عمر کا لڑکا کھڑا تھا۔ اُسی کی طرح لمبے لمبے بال۔
 ”چائے لے آؤ اور مکی کی روٹی“

تھوڑی دیر میں لڑکا چائے لیکر آ گیا۔۔۔۔ اور اپنی بھیگی پلکیں گرتے گرتے دامن

سے صاف کرنے لگا۔ اُس کے چہرے پر یاسیت بھرے نقوش صاف نظر آ رہے تھے۔
 --- پرویز کو لڑکے سے خاص اُنس ہوا۔۔۔ اور پھر یہ جانکاری ملی کی وہ اوڑی کا رہنے
 والا ہے۔ والد اور بہن جانکاہ زلزلہ کی زد میں آ گئے۔۔۔ پڑھائی چھوڑ کر اس چائے
 خانے میں نوکری کر رہا ہے تاکہ اپنے ساتھ ساتھ نایب ناماں کو پال سکے۔
 اگلے روز پرویز چائے پینے آیا تو دیکھا چائے خانہ کا مالک رزاق کی ماریپیٹ کر
 رہا ہے۔

”چھوٹا لڑکا ہے۔ تمہیں اسے مارتے رحم نہیں آتا۔ آخر کیا قصور ہے اس کا۔
 پرویز بر جستہ غصے میں آ کر کہہ گیا۔

”برتن صاف کرتے ہوئے دوپٹیں توڑ دیں۔ حرام
 خورد نہ جانے دھیان کہاں ہوتا ہے۔“

پرویز کی رگ حمیت جاگ اُٹھی۔ رزاق کی طرف دیکھا جو برابر رو رہا تھا۔ دفعتاً
 پرویز نے رزاق کا ہاتھ پکڑا اور گرج دار آواز میں کہا

”رزاق چلو میرے ساتھ! تمہاری ظلمت بھری رات
 کا خاتمہ ہو گیا۔ تمہاری غم زدہ زندگی میں خوشیوں بھرا
 سویرا اُبھرنے کو ہے۔“

اور وہ دونوں ایک نئے جذبہ کے ساتھ چائے خانے سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

گواہ گرانمایہ

عابدہ کے ساتھ باتوں کا سلسلہ کیا شروع ہوا کہ کامران کے تن من میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

عابدہ نے محبت نامہ کا جواب اُلفت بھرے لہجے میں کیا دیا کہ کامران کی چھوٹی سی نگری میں انبساط و شادمانی بکیرا کرنے لگی اور عابدہ جب سدا کے لئے کامران کی زندگی سے منسلک ہو گئی تو کامران خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ جیسے اُسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہو۔ ابھی مشکل سے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ عابدہ اور کامران خلاف توقع ایک دوسرے سے کھینچے کھینچے رہنے لگے۔ بدگمانی و بدظنی کا ہدف بنے لفظ بہ لفظ اپنائیت و انسیت کی جگہ نفرت نے لینی شروع کر دی۔ جیسے محبت کے جام چھلک کر خالی ہو گئے ہوں!

دیکھتے ہی دیکھتے کامران نے اپنی انا پچانے اور خفت مٹانے کی نیت سے جان پہچان والی محفلوں میں کچھ اس طرح زبان واکرنے میں اپنی عافیت جان لی۔

”ماننا پڑتا ہے کہ عورت مرد کی پرواز میں سب سے بڑی کوتاہی ہوا کرتی ہے۔ کاش داناؤں کی اس نصیحت کو پہلے خاطر میں لایا ہوتا تو ایک سے دو بن جانے کی حماقت کبھی نہ کرتا۔“

اس کے برعکس جب راز دار سہیلی سلیقہ نے عابدہ کی رگ حمیت کو چھیڑا تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے منڈلانے لگی کہ کامران شادی سے قبل ہی مردانگی سے وابستہ گواہ گرانمایہ کو بدنام گلی کی کسی چوکھٹ کی نذر کر چکا ہے۔

موری کے کیڑے

حاجی محمد اکرم کے قالین بننے کے کارخانے کو اچانک آگ نے پوری طرح پر اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

آگ بجھانے والا عملہ انتھک کوششیں کرتا رہا لیکن وہ کارخانہ کونہ بچا سکے۔ البتہ کارخانے سے ملحق حاجی صاحب کی چار منزلہ عالیشان کوٹھی بھی اپنے ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اس لمبی چوڑی کوٹھی میں حاجی صاحب اپنی شریک حیات دو بچوں اور چند چاکروں کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ اس کوٹھی اور کارخانہ کے درمیان ایک جھوپڑا ہے جس میں حمالی پیشہ سے وابستہ احمد افراد خانہ کے ساتھ برائے نام زندگی کے ایام سختی میں کاٹ رہا ہے۔

فائر بریگیڈ عملہ نے حاجی صاحب کی نظر عنایت پاتے ہی کوٹھی کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ کوٹھی تو آگ سے محفوظ رہی۔ مگر المیہ یہ ہوا کہ احمد کے جھوپڑے کی جانب ازراہ انسانیت کسی ایک نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ لاکھ جتن کرنے کے باوجود احمد جھوپڑے کو راکھ ہونے سے نہ بچا سکا۔

اگلے روز حاجی صاحب کی کوٹھی پر ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔۔۔ انشورنس ایجنٹ کے ساتھ ساتھ کچھ سرکاری کارندے

کارخانہ کے نقصانات کا تخمینہ لگانے کے لئے آگئے۔ مہمانوں کے لئے طرح طرح کے پکوان تیار کئے گئے تھے۔

کارخانہ اور کوشی کے پاس ہی جلع ہوئے ملبہ کے ڈھیر پر احمد اپنی دل شکستہ بیوی اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں سمیت بے سروسامانی کی حالت میں پڑا تھا۔ کسی ایک نے اس لئے ہوئے گھرانے کے افراد کی طرف ازراہ ہمدردی بھی نہیں جھانکا جیسے وہ آدم زاد نہیں بلکہ موری کے کیڑے ہوں۔



مشورہ

رام سرن متوسط گھرانے کا چشم و چراغ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ غریبوں کے لئے اُس کے دل میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

اسکول آتے جاتے پینل چوک کے ٹکڑ پر بیٹھی بھکارن کو وہ بلا ناغہ جیب خرچ میں سے ایک روپیہ دیا کرتا تھا۔ وہ دعائیں دیتی تو رام سرن مشفقانہ نظروں سے اُسے گھورتا۔

آج پچھلے دو دنوں سے بھکارن کو اپنی جگہ نہ پا کر رام سرن پریشان سا ہوا۔ معلوم کرنے پر جانکاری ملی کہ وہ مندر والی سرائے میں بیمار پڑی ہے۔

اسکول سے فراغت پائے رام سرن سیدھے سرائے چلا گیا اور تھری ویلر میں بھکارن کو ڈاکٹر گیتا کے کلنک پہنچایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد دوایاں لکھیں اور اپنی فیس طلب کی۔ بھکارن کے پاس کچھ ریزگاری تھی۔ وہ رگن کے اور کچھ رقم اپنی جیب میں سے ڈالے فیس ادا کی گئی تو ڈاکٹر کی آواز گونجی۔

”بہت کمزوری ہے اسے کھانے میں لگھی، دودھ،

انڈے اور پھل دیا کرو“

یہ سنتا تھا کہ رام سرن بولا ”ڈاکٹر صاحب جن لوگوں

کو دال روٹی مشکل سے میسر ہوتی ہے وہ یہ سب چیزیں

کہاں سے لائیں۔ پھر بھی آپ کے مشورہ سے کئے لئے

بہت بہت شکریہ۔“



اپنا بیت کا صلہ

والدین کی بے وقت رحلت کے بعد نسرین دو چھوٹی بہنوں اور چھوٹے بھائی کا واحد سہارا رہ گئی تھی۔ ماں کی آخری خواہش کے بموجب اُس نے بہنوں اور بھائی کی زندگیوں میں بشارت کا رنگ بھرنے کی نیت سے تعلیم کو خیر باد کہے جگہ جگہ نوکری حاصل کرنے کی تگ و دو کر لی تاکہ اپنے سمیت چار نفوس کو پال سکے۔ لیکن کسی ایک نے ازراہ مروت نسرین کی جانب دست تعاون دراز کرنے کی زحمت گوار نہیں کی۔ بلکہ جس کسی کے رو برو اُس نے اپنی روئیداد دُھرائی اُسی نے نسرین کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہا۔

نسرین چاہتی تھی کہ بہنیں اور بھائی پڑھ لکھ کر اعلیٰ مقام حاصل کر لیں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کی خاطر نسرین کو وہ لباس زیب تن کرنا پڑا جس کو چھوٹا بھی اُس کو گوارا نہ تھا۔ الغرض تھک ہار کر فقط بھائی بہنوں کے مستقبل کو درخشاں دیکھنے کی غرض سے نسرین نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ بہنیں اور بھائی پڑھ لکھ کر برسرِ روزگار ہوئے اور ازدواجی زندگی کی دہلیز کو چھونے میں کامیاب ہو گئے۔ سارا خرچہ نسرین نے برداشت کیا۔۔۔ ایرے غیرے سے اصلیت جان کے انہوں نے نسرین کے احسانات و قربانی کو خاطر میں نہ لائے اُس سے کنارا کشی اختیار کرنے کو ترجیح دی۔

لے دے کے عمر ڈھلتے ہی نسرین کو اُداسی و مایوسی کے بحرِ بے کراں میں غرق بے
سہارا ہونا پڑا۔ جن کی بھلائی اور خوشی کے لئے اُس نے اپنی جوانی، اپنی زینت اور اپنی
اُمّتوں کو داؤ پر لگا دیا وہی اُسے اپنا حریف گردانے لگے۔

اور اب جبکہ بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں عیش اور سکون کے ساتھ زندگی
گزارنے میں محو ہیں نسرین بڑھاپے کے عالم میں یتیم خانہ کی چوکھٹ پر بے سروسامانی کی
حالت میں جی رہی ہے۔ اُس کا کوئی پُرسان حال نہیں۔



کڑوا سچ

”تم شادی کیوں نہیں کرتے“ ریاض نے مسرور سے پوچھا
 ”کیا کروں کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی“ مسرور نے جواب دیا۔
 ”کیوں! کیا شہر سرائنگ میں خوبصورت لڑکیوں کا کال پڑا ہے“
 ریاض نے شوخی سے پوچھا۔

”کیا کروں لڑکی اگر خوبصورت ہے تو خوب سیرت نہیں
 ہوتی۔ اور اگر خوب سیرت ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی نقص
 ہوتا ہے کبھی رنگ کالا، ہونٹ موٹے یا قد میں فرق“
 ”برخوردار یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہاری
 عمر چالیس سال سے زیادہ ہے“ ریاض نے تلمہ دیا

کچھ ہفتوں بعد ریاض کی پہلی پر مسرور کو فیروزہ نامی لڑکی دکھائی گئی۔ نہایت
 خوبصورت اور متوازن خدوخال کی مالکہ یہ جان کر کہ لڑکی گریجویٹ ہے اور گھریلو
 امورات میں ماہر مسرور نے حامی بھری۔ عین اُس وقت جب کہ ریاض نے مٹھائی کا ڈبہ
 کھولنا چاہا فیروزہ کے والد نے زبان واکا۔

”ہاں تو مسرور بیٹے اپنی بابت ذرا تفصیل سے جانکاری دو“

”پڑھا لکھا ہوں، اور پرائیویٹ فرم میں منبر
ہوں۔ پانچ ہزار روپے مشاہرہ پاتا ہوں۔۔۔ گھر میں
ماں اور چھوٹی بہن ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے جائیداد، بینک بیلنس کی بابت کچھ بتائے۔“
”اس بابت قابل ذکر کچھ نہیں۔ ویسے آپ کو میرے
سے زیادہ میری دولت اور جائیداد سے دل چسپی کیوں
ہے؟“

مسرور برجستہ انداز میں کہہ گیا۔

”برخوردار ہماری لڑکی میں کوئی بُرائی یا عیب نہیں۔
اس اُدھیڑ عمری میں اٹھاراں سالہ لڑکی کا ہاتھ مانگنے آئے
ہو۔۔۔ زمین جائیداد سے محروم ہو اور پھر بہن کی شادی
کے اخراجات بھی تم کو ہی برداشت کرنے ہیں۔۔۔۔۔
ان حالات میں ہماری بیٹی کو کون سی خوشی دو گے۔۔۔
نہیں ہم اپنی بیٹی پر یہ بڑا ظلم نہیں کر سکتے۔“

یہ کہہ کر فیروزہ والدین کے ساتھ چلی گئی اور کڑوا سچ سن کر مسرور کے چہرہ پر
اُداسی چھا گئی۔ وہ اور اُس کی ہستی ڈگمگانے لگی۔



تارکول کا ڈرم

عیدہ گاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ نماز عید شروع ہونے میں صرف چند گھڑیاں باقی تھیں۔ نئے اجلے اور بھڑکیلے لباس میں ملبوس لوگ احترام سے صفوں میں براجمان پیش امام کی تمہیدی تقریر سننے کے لئے بے تاب تھے۔ کچھ لوگ خلاف توقع آپس میں مختلف موضوعات پر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ کی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے جوتوں پر مرکوز تھیں۔ جوتوں، سیپروں اور چپلوں کے تلوے ملے ہوئے تھے اور صفوں کے سامنے سجدے کی جگہ سے ایک انچ آگے رکھے ہوئے تھے۔ کچھ نمازی دلہن کی طرح سجائے بچے اپنے ساتھ لائے تھے۔

مولوی صاحب کی صحت قابل رشک تھی۔ مائیکروفون اگر نہ بھی ہوتا تو بھی ان کی گرج دار آواز آخری صف تک ضرور پہنچ جاتی۔ ان کی تقریر کا نفس مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

”دین اسلام مساوات اور رواداری کا علمبردار ہے۔

اللہ کے حضور سب کے سب برابر ہیں۔ کسی عربی گونجی پر یا

عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔۔۔۔۔ اسلام نے امیر و

غریب، گورے و کالے اور رنگ و نسل کی تمیز ختم کر دی

ہے۔ دولت، عہدہ یا مرتبت کی بنیاد پر کسی ایک کو فضیلت
ملنے والی نہیں! پروردگار کو فقط تقویٰ و پرہیزگاری پسند
ہے۔۔۔۔۔“

آخری صف میں بر اجماع سیاہ فام شخص اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ
ایک دراز قد نو جوان تھا۔ آنکھیں روشن، لیکن اندر کو دھنسی ہوئی اور چہرہ سپاٹ، اس کے
لباس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ زندگی کا بوجھ اٹھاتے اور سہتے اس کی ریڑھ کی ہڈی
کمان کی طرح خم دار ہو گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ آگے بڑھا۔

”بیٹھ جاؤ کالے“۔ ایک دبے پتلے شخص نے سیاہ

فام کا بازو تھامتے ہوئے کہا

”ابے کیا بندریا تلاش کر رہا ہے“

سیاہ فام شخص نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ساتھ ہی وہ اگلی صف میں کھڑا
ہونے کے لئے آگے بڑھا۔

”دور ہٹ یا ر“ بھاری بھر کم شخص نے اس کو دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تو آدمی یا تار کول کا ڈرم“

سیاہ فام شخص خاموش رہا اور خاموشی سے اس صف سے نکل کر اگلی صف میں جا کر
کھڑا ہو گیا۔

”اوہو! بڑے ہی احمق ہو“۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے

بہت ہی غصے سے کہا ”شرم نہیں آتی! اپنا غلیظ پاؤں

میرے ابلے سلیپر پر رکھ دیا“۔

سیاہ فام شخص نے عمر رسیدہ بزرگ کے غصے کو نظر انداز کر دیا اور اس صف سے بھی نکل کر اگلی صف میں پہنچ گیا۔

پاس والے خوش باش شخص نے نفرت کی نظروں سے گھور کے اچک کر اپنا جوتا اٹھایا۔ اور اگلی صف میں چل دیا۔ ساتھ ہی اس کی زبان بھی چلنے لگی۔

”اے بد بخت! بندگی میں بھی روڑے اٹکاتا ہے“

اتنے میں الصلوٰۃ کے ساتھ لوگ کھڑے ہو گئے۔ اور ”اللہ اکبر“ کی اونچی آواز کے بعد نماز عید شروع ہو گئی۔ سیاہ فام شخص بت بنا کھڑا سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کی اسلامی قدروں سے لبریز باتوں کو لوگ اس سرعت کے ساتھ کیوں کر فراموش کر گئے۔۔۔؟



میرے اپنے

کب سوچا تھا کہ بگڑا مقدر ایسا کھیل بھی کھیلے گا۔ ساری زندگی روزی روٹی کی بھاگ دوڑ، رات و دن کی جدوجہد اور کنبہ کی پرورش کی تگ و دو میں بیت گئی۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ اتنا طویل عرصہ کیسے گزر گیا۔

سوچا تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فرصت کا مزہ لینے اور زیست کے باقی ماندہ ایام آرام سے بتائیں گے۔ رٹائرمنٹ کے کچھ ماہ بعد اچانک ہی تکلیف ہوئی۔ مقامی ہسپتال میں معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ گردوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ اور کم از کم ایک گردے کا ٹرانس پلانٹیشن (Transplantation) تو کروانا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی علاج نہیں۔ نہ جانے اس بڑھاپے میں کن بُرے کاموں کا بدلہ ملا۔ زندگی یک لخت جہنم ہی بن گئی ہے۔

افراد خانہ میں پھسپھساہٹ شروع ہوئی۔ آخر گردہ دستیاب ہو تو کہاں سے۔ بڑے بیٹے کی رگوں میں رواں خون نے جوش مارا۔ اُس نے اپنا ایک گردہ دینے کی بات منہ سے نکالی ہی تھی کہ بہورانی نے رور و کر بُرا حال کیا۔ اپنی اور بچوں کی قسمیں دے ڈالیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مایکے سے اپنے والدین کو بلوایا اور بڑا بیٹا گردہ نہ دینے پر مجبور ہوا۔

منجھلی بہو نے تو دو ٹوک بات کہی کہ جب بڑے بھائی صاحب گردہ نہیں دے

رہے ہیں تو ہم ہی کیوں دیں۔ ہم بھی تو بال بچوں والے ہیں۔
چھوٹا بیٹا ابھی کنوارا ہے ماں کا لاڈ لا بھی۔ اُس کی طرف سے اُس کی والدہ کہہ
اُٹھی۔

”اس کے تو ابھی کھیلنے کھلانے کے دن ہیں۔ اُس
نے اپنا گردہ دے دیا تو کل اُسے اپنی لڑکی کون دے گا۔“
بچاری عورت کیسے اُلجھن میں پھنس جاتی ہے۔ شوہر اور بیٹے میں کسے فضیلت
دے۔ آخر اپنے پیٹ جائے کا پلڑا ابھاری پڑ گیا۔
اب لے دے کے اپنائیت کا مظاہر کرتے ہوئے اخباروں میں اشتہار دیئے
جارہے ہیں۔ سنا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ میں گردہ مل جائے گا۔
اب یہ خیال بری طرح ستانے لگا ہے کہ ریٹائرمنٹ پر ملی بڑی رقم مکان کی
دوسری منزل اور باہری غسل خانہ تعمیر کرنے پر صرف کرنے کے بجائے اپنے پاس ہوتی تو
یہ لاچاری کے ایام نہ دیکھنے پڑتے۔



سراب

جاوید کو شہر کا ہر دل عزیز موصور گردانا جاتا ہے۔ دراصل والدین کی حادثاتی موت نے جاوید کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ کہاں چنچل طبیعت لئے ہر وقت زندہ دلی سے ہر ایک کے ساتھ پیش آنا اور کہاں اب اتنا سنجیدہ کہ کسی ایک سے گھل کر بات بھی نہیں کرتا۔

سدا خیالی دنیا میں کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ اور زیادہ تر تصویریں بنایا کرتا ہے۔ حسین اور دل آویز تصویریں۔ ہر خوبصورت شے یا ہستی کو کنواس میں مقید کرنے کے خواب دیکھا کرتا ہے۔

جاوید کے کوارٹر کے مقابل کوٹھی کب سے خالی پڑی تھی اور آج آباد ہو گئی۔ ٹیلیارمضان کی زبانی جانکاری ملی کہ ایک میجر صاحب نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد اس بنگلہ میں رہنے آئے ہیں۔ ساتھ میں اُن کی شریک حیات، ماں اور ایک بیٹی ہے۔

جاوید نے کمرہ شب باشی کے پچھواڑے کی کھڑکی کیا کھول دی کہ دیکھتا رہ گیا۔ سامنے دالان میں کرسی پر بیٹھی ایک زندہ مورت نظر آئی بے حد خوبصورت چہرہ، لمبے بال اور آنکھوں پر کالی عینک چڑھی ہوئی۔

حسب عادت جاوید نے اُس کی تصویر بنانی شروع کی۔ اب تو شام کو بسا اوقات وہ کھڑکی کے پٹ کھولے مورتی کی صورت دیکھنے کے لئے بے قرار رہتا۔

کچھ ہفتوں کی ریاضت کے بعد تصویر مکمل ہو گئی۔

ایک روز جبکہ جاوید دفتر سے واپس آیا تو رمضان نے ایک لفافہ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”میجر کی لڑکی کی سالگرہ تھی اور اُسے دعوت میں بلایا ہے“ جاوید نے موقع غنیمت جان لیا۔ مقررہ دن تصویر کو کاغذی غلاف میں مُقید میجر کے گھر گیا۔

تصویر کی نقاب کشائی کرنے کے ساتھ ہی میجر صاحب چلائے ”اُف کس قدر حسین اور دیدہ زیب تصویر۔ ہو بہو ہماری قدسیہ جیسی“

”یہ قدسیہ کے لئے میرا تحفہ سمجھئے“ جاوید بے تامل کہہ گیا۔

”مگر وہ اس تحفہ کا کیا کرے گی“ میجر کی بیوی نے لقمہ دیا

”آخر کیوں؟“ جاوید حیرانی کے عالم میں بولا۔

”وہ تو اندھی ہے“ میجر نے مری مری آواز میں کہا

”یہ سننا تھا کہ جاوید کے ہاتھوں سے تصویر فرش پر گر

گئی۔ اور شیشے کی کرچیوں دیکھتے ہی دیکھتے جاوید کے

خوابوں کو ریزہ ریزہ کر گئی۔



رغبت

شریک زیست کی حادثاتی موت کے بعد لوگوں کا منہ بند کرنے کی خاطر سوتیلی ماں نے شگفتہ کی بھرپور جوانی کا اچھے دامنوں سودا کر دیا۔ رفیق زندگی دلا اور پہلوان بھاری بھر کم شخصیت کے مالک تھے اور اول درجہ کے عیاش و شرابی۔

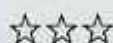
خدا کا کرنا کہ شادی کے کچھ مہینہ بعد ہی دلا اور دائمی نیند سو کر شگفتہ کو بے آسرا کر گیا۔ از دو اجی زیست کی دہلیز کو چھونے پر شگفتہ کی زندگی کا جو مستی بھرا پہلو روشن ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھپ اندھیرے میں نیست و نابود ہو گیا۔ الغرض عین عالم شباب میں قدرت نے شگفتہ کو از دو اجی زیست سے وابستہ لذات سے محروم کر دیا۔

شگفتہ میٹرک تک پڑھی تھی اور تھوڑی بہت تگ و دو کرنے کے بعد مقامی زنانہ اسکول میں اُستانی کی جگہ مل گئی۔ البتہ وہ جنسی خواہشات کے طوفان کو باوجود لاکھ کوشش کے نہ روک سکی۔ ویسے بھی یہ اصلیت اپنی جگہ اٹل کہ اگر کسی ندی کا باندھ سیلابی دباؤ سے ٹوٹ جائے تو باہر سے ہر طرح کی مرمت کرنے کے باوجود پانی کا رکنما محال ہو جاتا ہے۔ پانی کے مکمل روک تھام کے لئے سب سے لازمی چیز تو اندرونی شگاف کو پاشنا ہوتا ہے۔

اس آڑے اور نازک وقت میں شگفتہ کو کوئی نیک صحبت نہ مل سکی جو کم از کم اُس کے جذبات بھرے خیالات میں متوازن تبدیلی پیدا کر دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ شگفتہ نے اپنے

جذباتِ نفس کی تسکین کے لئے ادھر ادھر جھانکنا شروع کر دیا۔ اسکول کی بوڑھی و تجربہ کار خادمہ رحیم بی نے شگفتہ کی بے قراری بھانپے قصبے کے شریف افراد سے اُس کی شناسائی کرائی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شگفتہ اس حلقہ میں کافی مقبول ہوئی اور بظاہر اطمینان و سکون کی زندگی گزارنے لگی۔

وقت کا پرندہ پرواز کرتا گیا۔ عمر ڈھلتے ہی شگفتہ کی ہر دلچیزی بھی گھٹتی گئی اور اب اُس کا یہ جنسی شغل محض اسکول کی جوان و خوبصورت لڑکیوں سے رغبت پیدا کرنے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔



مخبر

سرشام ہی آس پاس کی مسجدوں کے میناروں پر نصب لوڈ اسپیکروں کی وساطت
مکمل ہڑتال کرنے کی آوازیں فضا میں گونجیں!

آن واحد میں دکانیں بند، ٹرانسپورٹ معطل اور بازار سنسان نظر آنے لگا۔ پوچھ
تاچھ پر یہ اصلیت سامنے آگئی کہ ایک علیحدگی پسند زعم کے دُور کے رشتہ دار کو کسی نامعلوم
بندوق بردار نے کارخانے سے گھر واپس آتے گولیوں کو نشانہ بنایا۔ ہلاک شدہ شخص کی
بابت یہ بھی جانکاری ملی کہ کچھ ماہ پہلے تک وہ عسرت و افلاس کی زندگی گزار رہا تھا اور پھر نہ
جانے اُسے کہاں سے بے حساب دولت ملی کہ شاندار کوٹھی، موٹر کار اور سینٹ کارخانے کا
مالک بن بیٹھا۔

پندرہ سالہ محبوب گاؤں سے شہر اپنی خالہ زاد بہن کو ملنے آیا تھا اور کھل بھلی و
افراق فراقی کے عالم میں ”ڈاؤن ٹاؤن“ نہ جاسکا۔ اور اپنی جان بچانے کی خاطر میونسپل شڈ
میں جا بٹھیا۔ مزید خون خرابہ روکنے کی غرض سے شہر بھر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کیا گیا۔ ڈر اور
خوف کے مارے محبوب کو شڈ میں ہی رات گزارنی پڑی۔ سویرے بھوک پیاس نے اُسے
تنگ کیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں شڈ سے باہر جھانکا ہی تھا کہ ”ہالٹ“ کی گرجدار آواز نے
چونکا دیا۔ محبوب کی حالت ابتر تھی روتے روتے اُس نے ہاتھ اور کئے۔ دو وردی پوش

نمودار ہو گئے۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے پر انہوں نے محبوب کو دلا سہ دیا اور اپنے ساتھ بینکر میں لایا، کھلایا پلایا، اور پھر متعلقہ علاقے کی پولیس چوکی کے حوالے کر دیا۔ تاکہ محبوب بہن کے گھر جاسکے۔

پولیس والوں نے اپنی جیب میں بٹھا کر محبوب کو علاقے کی بڑی گلی کے کٹڑ پر چھوڑا۔ تنگ گلی میں محبوب نے ابھی کچھ قدم ہی بڑھائے تھے کہ گوشہ راست سے گولیاں چلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے محبوب وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گولولیس والوں نے گولیوں کی آواز سن کر پیچھا کیا لیکن بندوق بردار بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

محبوب کی خالہ زاد بہن راہیلہ و دیگر رشتہ دار اور محلے کے مکین اس جانکاہ حادثہ پر زار و قطار روئے، ساری بستی میں ماتم کا سماں بندھ گیا۔ لوگ طرح طرح سے لواحقین کو دلا سہ دینے لگے۔ اتنے میں ایک ریش دراز شخص بھیڑ کو چیرتے سامنے آ کے کہنے لگا۔

”ارے یہ لڑکا دراصل تجربہ کار کام کرتا تھا۔ میں نے

اُسے خود ملوی کی جیب سے اُترتے دیکھا ہے“

یہ سنتا تھا کہ لوگ ایک ایک کر کے اپنے گھروں کو جانے لگے اور لے دے کے اب محبوب کی لاش کے پاس اُس کی بہن اور قریبی رشتہ دار ہی رہ گئے۔ گویا ایک اور بے قصور کو بُھری کی آڑ میں دائمی نیند سُلا یا گیا۔



کباڑیا

لال دین ایک کباڑیا تھا

دن بھر ٹوٹا پھوٹا سامان، ردی کاغذ، ناکارہ ٹین اور
پُرانے اخبارات گھر گھر جا کے جمع کرتا اور شام کو دکاندار کو
فروخت کر کے برائے نام رقم وصول ہوتی۔ بیوی بچوں
کے ساتھ مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔

کچھ برس گزرنے کے بعد لال دین کی کایا اچانک
پلٹ گئی۔ دولت اُس کے قدم چومنے لگی۔ اور دیکھتے ہی
دیکھتے اُس کی خستہ جھونپڑی ایک عالیشان کوٹھی کا روپ
دہار گئی۔ ہر طرح کا سکھ لال دین کو حاصل ہے۔

دراصل اب لال دین آفیسروں، بیروکریٹوں اور
منسٹروں کے بنگلوں کے چکر لگایا کرتا ہے۔ جہاں خالی
کئے ہوئے قیمتی بریف کیس مٹی کے مولے ملتے ہیں اور وہ
بازار میں اُن کو اچھے داموں فروخت کر لیتا ہے۔



ہمدردی کی آڑ میں

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بھوت میں قیام پذیر تھا۔ سُدھ مہادیو کا سالانہ عرس شروع ہوا جو برابر ہفتہ بھر جاری رہتا ہے۔ اس میلہ میں ہزاروں کی تعداد میں ریاستی اور غیر ریاستی لوگ شوق سے شرکت کرنے آتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے عقیدت مندوں سے بھری گاڑیاں پہاڑی راستوں پر چلتی رہتی ہیں۔ اگلے روز صبح سے ہی بوند باندی ہوتی رہی۔۔۔۔۔ باد و باران کی وجہ سے سوار یوں سے بھری ایک گاڑی کا ڈرائیور کنٹرول کھو بیٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بس چیڑ کے درخت سے ٹکرائے گھرے کھڈ میں جا گری۔

کئی لوگ موقع پر ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، لاشوں کو چھوڑ زخمیوں کو علاج و معالجہ کی خاطر ہسپتال لے جانے کو ترجیح دی گئی۔ مجھے بھی دیگر اراکین کے ساتھ سرکاری گاری میں جائے واردات تک جانے کا موقع ملا۔ ہر طرف تباہی اور ویرانی کا سماں طاری تھا۔ لاشوں کو اٹھا رہے تھے کہ عقب میں کراہنے کی آواز نے چونکا دیا۔ ایک خاتون تھی جسے غالباً مردہ تصور کئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

ہم نے گاڑی میں خاتون کو ہسپتال لایا۔ راستہ بھر وہ بے ہوش پڑی رہی۔ البتہ سانس چل رہی تھی۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی کٹی ہوئی تھی اور زخم سے خون

بہرہا تھا خاتون کو ہسپتال میں چھوڑ کر میں کوارٹر میں واپس آیا جہاں رفیقہ حیات میری منتظر تھی۔

علی الصباح متذکرہ خاتون کا حال جاننے کی غرض سے ہسپتال گیا۔ اُس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ باتوں باتوں میں کئی ہوئی انگلی کی بابت استفسار کیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو سما گئے اور درد بھری آواز میں کہا۔

”بتاؤں کیا بیٹا! آپ لوگوں کے آنے سے قبل کچھ افراد آ گئے انہوں نے افراتفری مچائی۔۔۔ زیورات لوٹے۔۔۔ میں حیرت ناک مناظر دیکھ کر ہوش کھو بیٹھی۔۔۔ اتنے میں دھچکے کے ساتھ مجھے ہوش آیا دیکھا ایک نوجوان میری انگلی سے انگلی کھینچ رہا ہے۔ میں نے بہ مشکل تمام اُسے کہا ”بیٹے پہلے مجھے مرنے دو! پھر انگلی اُتار لینا“

اتنے میں کچھ لوگوں کا شور نزدیک سے سُنا دیا تو اُس نوجوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دفعتاً جیب سے چاقو نکالے پیتل کی مُندری کی خاطر میرے ہاتھ کہ انگلی قلم کر دی۔



برقع پوش

بھلا ہوا اس برقع کا

پرسوں دفتر سے نکل کر بھرے بازار سے گزر رہا تھا کہ سامنے بڑے چوک کی کڑ
پر لوگوں کی بھیڑ دیکھنے کی ملی۔ حقیقت حال سے باخبر ہونے کی خاطر آگے بڑھا ایک وجہ
اور خوب رو جوان برقع پوش خاتون کو اپنی منیکٹر جتا رہا تھا ساتھ ہی دوسرے شخص کا دعویٰ کہ
خاتون اُس کی بیوی ہے۔ دونوں میں ٹوٹوں میں میں ہوتی رہی اور لوگ تماشہ دیکھنے
میں مشغول، اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص خاتون سے مخاطب ہوا۔

”بیٹی ذرا تم ہی معاملے پر روشنی ڈالو! آخر اصلیت کیا ہے؟“

یہ سنا تھا کہ برقع پوش خاتون پھری گئی اور نفرت آمیز لہجے میں زبان وا کر دی۔
”ان دونوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں“

یہ کہہ کر اُس نے برقع کا اگلا پٹ الٹ دیا اور دونوں جوانوں پر جیسے بجلی گری۔
وہ ایسے غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

متذکرہ خاتون کافی تھی اور اُس کا چہرہ چچک کے داغوں سے لبریز!



شناختی کارڈ

تحریکی زعمیم کو گرفتار کرنے کے بعد ماحول میں افراتفری اور سرایسنگی کے نقوش واضح انداز میں اُبھرنے لگے۔ حالات نہایت ہی کشیدہ۔۔۔ دو دنوں سے ہڑتال چل رہی تھی کچھ جوانوں نے دل کا غبار نکالنے کی چاہ میں فورسز پر پتھراؤ کیا اور سرکار کے خلاف نعرے بلند کئے۔ نتیجے میں پتھروں، لائیووں اور آنسو گیس کا بے تحاشا استعمال ہوا۔

خورشید کو فون پر اطلاع ملی کہ اُس کا چھوٹا بھائی توفیق زخمی حالت میں اسٹیٹ ہسپتال میں پڑا ہے۔ خورشید نے اسکوٹرسارٹ کیا اور ہسپتال کی جانب پریشانی کے عالم میں چل پڑا۔ بائی پاس پر فورسز کے جوان ”شناختی کارڈ“ چک کر رہے تھے۔ خورشید کارڈ گھر میں چھوڑ آئے تھے۔ اصلیت کیا بتادی کہ اُسے قریباً تین گھنٹے تک حراست میں رکھا گیا اور پھر مقامی پولیس سب اسٹیشن کے حوالے کیا گیا۔

خورشید نے چوکی آفیسر کو حقیقت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے ڈرائیور کو ہدایت دی کہ خورشید کو اُن کے گھر چھوڑ آؤ۔

توفیق کی لاش ہسپتال سے آگئی تھی اور خورشید سرپیٹ کے بلک بلک کر رویا جب اُسے علم ہوا کہ توفیق نے جان دیتے وقت اُسے خوب دیا دیا تھا۔

اتنے میں خورشید کی نظر تپائی پر پڑے ”شناختی کارڈ“ پر پڑی اور اضطرابی کیفیت میں اُس کے پُزے کر دیئے۔ گویا اپنا سارا غصہ بے جان شے پر اُتار دیا۔



دوسرا رُوپ

پُچا محکمہ آبپاشی میں ایٹینو کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ دفتر کے اکثر اراکین اُس کے بے مثال حُسن اور متوازن خدو خال پر فریفتہ ہونے لگے۔ چھوٹے صاحبِ کشور کمار خاص طور سے پُچا میں ضرورت سے زیادہ دل چسپی لینے لگے۔ وہ دن میں کئی بار ڈکٹیشن لینے کے بہانے اُسے یاد کرتے۔ لحظہ بہ لحظہ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے اور تو اور کشور کمار کے دل میں آرزو جاگ اُٹھی کہ وہ پُچا کو جیون ساتھی کے طور پُجن لے۔

ابھی وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شام لنگوٹھے یار ماسٹر پرویز نے داد عیش دلوانے کی غرض سے کشور کمار کو جہلم کے کنارے ”بیوٹی کوئن“ نامی ہاؤس بوٹ کی سیر کرائی۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ ارد گرد کی بستی نیند کی آغوش میں جانے کے بعد بدنام کوٹھے آباد ہوتے ہیں۔

پرویز نے کیبن تک ساتھ دیا۔ خفیف سی روشنی کیبن کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ کشور کمار نے ارد گرد کا بغور جائزہ لینا شروع کیا اور دفعتاً اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

سامنے پلنگ پر نیم عریاں لباس میں ملبوس پُچا شان بے نیازی کے ساتھ اُسے گھور رہی تھی۔



سفید خون

لیٹروں نے سردار کے کہنے پر نواب فیروز الدین کے اکلوتے فرزند بختیار کو اسکول سے واپسی پر اغوا کر لیا۔ سردار بہت ہی مسرور نظر آ رہے تھے۔ جانتے تھے کہ دولت مند اور نامی گرامی باپ کے بیٹے کے عوض اُن کو منہ مانگی رقم مل سکتی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر بڑے کھانے کا اہتمام کیا گیا۔۔۔۔ ساتھیوں کے ساتھ داد عیش لینے کی نیت سے شراب کی محفل سجائی گئی اور پھر کُل بدن کے نیم عریاں رقص سے سب کے سب محظوظ ہونے لگے۔۔۔۔ انبساط بھرا یہ دور رات گئے تک جاری رہا۔

نشہ کا فورہ ہونے پر سردار نے صبح سویرے خوشی خوشی موٹیل پر نواب صاحب کا نمبر گھمایا

نواب صاحب نے خود ہی فون اٹھایا۔

”آپ کا بیٹا بختیار ہماری حراست میں ہے۔ اُس کی رہائی کی خاطر دو لاکھ کی رقم لیکر شاہی باغ کے چبوترے میں رات کے نو بجے آجائے۔ پولیس کو خبر نہ کریں۔ ورنہ پچھتاو گے“

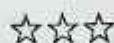
کچھ توقف کے بعد نواب کی آواز گونجنے لگی۔

”بندہ پرور: آپ کو مطلوبہ رقم مل جائے گی البتہ شرط

یہ ہے کہ بختیار کی زندگی کا خاتمہ کر دو“

سردار اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ تذبذب کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات کے دھارے بھوٹنے لگے۔۔۔ آخر بختیار کی موت سے نواب صاحب کو کیا حاصل ہوگا۔۔۔ کیا وہ اُس کا رگ بیٹا نہیں۔۔۔ آخر اصلیت کیا ہے؟

اس کے بعد اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے سردار ابراہیم نے بختیار کو صحیح سلامت اُس کے گھر پہنچا دیا۔



سرکار کا خیر خواہ

صندوق کتابوں کی وجہ سے بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔ باجی کے اصرار پر ارشاد نے
 جموں ریلوے اسٹیشن پر سامان کا وزن کرانا چاہا لیکن لنگوٹھے یا رزیندر برس پڑے۔

”ارے ڈرپوک کیوں گھبراتے ہو، تم تو طالب علم
 ہو۔ اور پھر صندوق میں کتابیں ہی تو ہیں۔ وزن تھوڑا
 زیادہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں“

گاڑی تیز چل رہی تھی۔ اور ارشاد سوچ رہا تھا کہ اگر سامان کا وزن کرایا گیا تو
 لینے کے دینے پڑینگے۔ رات دیر گئے علی گڑھ اسٹیشن پر ریل گاڑی رُک گئی۔۔۔۔۔ ارشاد
 نے فنی کو صندوق، اپنی تھمادی اور بستر بندھ بیڈ بیگ لیکر اسٹیشن سے باہر آنے لگا۔
 ”ٹکٹ دکھائیے“ سفید وردی پہنے ٹکٹ چکر سامنے کھڑا تھا۔

ارشاد نے ٹکٹ اُس کے ہاتھ میں تھمادی
 ”آپ کے سامان کا وزن زیادہ لگتا ہے“

”ہاں کچھ زیادہ ہے، البتہ صندوق میں سوائے کتابوں کے کچھ نہیں ہے۔“
 ارشاد نے عاجزی کیساتھ جواب دیا۔

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ گورنمنٹ کا نقصان

ہو۔ کتابیں چھوڑا اگر صندوق میں مٹی بھی بھر دو بھاڑا دینا

پڑے گا۔“

خیر وزن کرانے پر ٹکٹ چکر کچھ توقف کے بعد بولے

”ڈیڑھ سو روپے بنتے ہیں۔۔۔ اس کے بعد دیر تک ریلوے کے قواعد سمجھاتا

رہا۔ پھر ارشاد کے قریب جا کر رازدارانہ انداز میں زبان کھولی۔

”اچھا تو ایک سو روپے دو۔ اُس صورت میں رسید

نہیں ملے گی۔“ ارشاد سوچنے لگا کہ ایک سو روپے دوں تو

اس حرام خور کو ساری رقم ہڑپ کرنے کا موقع ملے گا۔

دفعتاً اُس نے ڈیڑھ سو کی رقم چیکر کے ہاتھ میں تھما دی۔

”رسید دیجئے“

”ارے بابا ناراض ہو گئے۔ چلو اسی روپے ہی دیدو“

”نہیں مجھے پوری رقم کی رسید چاہئے“ ارشاد نے تلخ لہجہ اپنایا۔

رسید لے کر ارشاد ایک فاتح کی طرح اسٹیشن سے باہر آیا اُس کے ماتھے پر

اطمینان و سکون کے آثار نمایاں تھے۔



تضاد

اقبال خوش حال گھرانے کا یار باش اور خوب رُونو جوان تھا۔ اُسے دوستوں سے خلوص سے پیش آنے اور اُن کے ساتھ گپیں مارنے میں سکون ملتا تھا۔

یار دوستوں کی ہر طرح سے دل جوئی کرنے میں اُسے اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ جس دن نیا دوست یا ساتھی بنا لیتا تو اقبال کو ایسا لگتا کہ اپنی ویران زندگی کے ایک خلا کو پُر کر لیا ہے۔

اقبال کے دوست یوں ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر قسم کے لوگ تھے۔ خوبصورت، اوسط درجے کے حسین اور بد صورت بھی تمام دوستوں کی خاطر مدارات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ ہر وقت اور ہر حال میں دوستوں کی صحبت اپنانا اور پھر طرح طرح کی باتوں میں مشغول رہنا اُس کا معمول بن چکا تھا۔ برتری کا احساس سوار ہوتا تو اقبال تمام دوستوں کے لئے تفریح طبع کا مناسب انتظام کر دیتا تھا۔ اس فراخ دلی پر سب اُس کے احسان مند رہتے تھے۔ اگر کسی اپنے ساتھی کو کسی ایرے غیرے سے بات کرتے دیکھتا تو اقبال کو جلن ہوتی تھی۔ ایسے دوست سے وہ خفا ہوتا۔

کچھ ہفتے گزر گئے یار دوستوں نے محسوس کیا کہ اقبال کا اُنیت و اپنائیت سے بھرا جذبہ آہستہ آہستہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

اب وہ دوستوں کے لئے پریشان نہیں رہتا۔ جن کی صحبت اپنانے کی خاطر اقبال سرگرداں رہتا تھا وہی اب اُس کی جھلک پانے کے لئے بہت زیادہ بے چین رہنے لگے۔

اب اقبال خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ گھر سے بہت کم باہر آتا تھا اس بے
 توجہی اور بے اتفاقی کی وجہ جاننے کے لئے تمام دوست ایک دوسرے سے تبادلہ خیال
 کرنے لگے۔۔۔ آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ اقبال اس قدر بدل گئے۔۔۔ کچھ احباب
 حالات سے تنگ آکر اصلیت جاننے کی چاہ میں اقبال سے ملنے کا پروگرام ترتیب دے
 رہے تھے کہ اقبال کے یار غار امین تاز نمودار ہوئے اور اس راز پر سے پردہ اٹھا دیا کہ ”اقبال
 آج کل عشق فرما رہے ہیں۔“



بوجھ

وسیم اور اُس کی رفیقہ حیات رشیدہ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ وسیم بچک میں نیچر تھے۔ اور اُن کی اتنی معقول تنخواہ تھی کہ اخراجات پورے کرنے پر کچھ پس انداز بھی ہوتا۔ یکے بعد دیگرے اُن کے چار بیٹے ہو گئے رشیدہ بہت خوش تھی اولاد زینہ پا کر۔ البتہ دونوں کو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں لڑکی سے محروم رکھا ہے۔

وقت گذرتا گیا۔ بیٹے جوان ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی شادیاں بھی ہو گئی۔ بھرے پورے گھر میں چار بہوئیں بھی آ گئیں۔ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ خوشی کے ساتھ غم کا آنا لازمی ہے اور یہ خوشی بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی۔

ایک دن وسیم دفتر سے گھر آ رہے تھے کہ بڑے چوک میں ایک ہتھ گولہ پھٹ گیا۔۔۔ کچھ افراد موقع واردات پر ہی ہلاک ہو گئے اُن میں وسیم بھی شامل تھے۔

رشیدہ زندگی کے ساتھی کے بغیر مانو ٹوٹ ٹوٹ سی گئی۔ کچھ دن تک گھریلو معاملات ٹھیک چلتے رہے۔ آہستہ آہستہ مزاج میں یکسانیت نہ ہونے کے باعث بہوؤں میں جھگڑا ہونے لگا۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بھائیوں میں پہلے جیسا پیار نہ رہا۔ اور انہوں نے آپس میں منقولہ جائیداد کا بٹوارہ کر لیا۔ کل تک شوہر کی سرپرستی میں گھرانہ خوشحال تھا اُن کی موت کے بعد بکھر کے رہ گیا۔ زمین اور حویلی فروخت کر کے بھائیوں نے الگ بستیوں

میں اپنے لئے مکان تعمیر کرائے۔ پہلے سب بھائی ایک دوسرے کی دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے لیکن اب اپنا پن نہ رہا۔

رشیدہ بڑے لڑکے کے ساتھ رہی۔ کچھ دنوں حالات میں سکون رہا۔ ایک شام جبکہ رشیدہ دالان میں چاول چُن رہی تھی۔ بیٹے سے بہو کو کہتے سنا۔

”ہم نے کیا ماں کو اپنے گھر میں رکھنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔“

آپ ماں سے کچھ کہتے کیوں نہیں۔ اور بھی تین بیٹے ہیں!

اُن کی بھی کچھ ذمہ داری ہے۔“

باقی بھائیوں کو بڑا یا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ماں سال میں تین مہینے ہر بیٹے کے ہاں رہے گی۔ سب نے یہ فیصلہ منظور کر لیا۔

اب رشیدہ کا سال بٹ گیا۔ تین ماہ کی آخری تاریخ آتی تو رشیدہ اپنا مختصر سامان اٹھا کر دوسرے بیٹے کے گھر جانے کی تیاری کرتی۔ رشیدہ کی زندگی بٹ کر رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ ماں باپ درجن بھر بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھکتے نہیں لیکن برسرِ روزگار بیٹوں کے لئے والدین بوجھ بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ کیسا پیار ہے۔



رفیق حیات

افتخار MBBS کر کے مزید تعلیم کے لئے انگلستان جانا چاہتا تھا۔ والد شیخ ریاض الدین کی خواہش تھی کہ افتخار زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے قابل ڈاکٹر بنے۔ البتہ ماں رفیقہ بیگم کا کہنا تھا کہ باہر جانے والے اکثر افراد کے خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ انگلستان جانے سے قبل لخت جگر کے سر پر سہرا بندھا دیکھے۔

الغرض افتخار کا نکاح اُس کے بچپن کی منگیتر شگفتہ سے ہوا اور یہ بھی طے پایا کہ رخصتی اُس کے لوٹنے کے بعد ہوگی۔ شگفتہ دراصل افتخار کی خالہ زاد بہن تھی۔ اُس نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد گھر میں ہی دینی اور ادبی کتابوں اور جریڈوں کا مطالعہ جاری رکھا۔ پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتی اور پھر محلے بھر کے بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرانا اُس نے اپنا معمول بنالیا۔ گویا مذہبی ماحول سے وابستہ اطمینان کی زندگی گزارتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر اُس کا غیر متزلزل بھروسہ تھا۔ اُس نے قرآن و حدیث کے حوالے سے ایک کتابچہ ”رفیق حیات“ کے عنوان سے ترتیب دے کر چھپوایا جسے کافی سراہا گیا۔

اُس کے چھوٹے بھائی احمد نے بھی شگفتہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ وقت کا پرندہ پرواز

کرتا گیا۔

افتخار نے انگلستان میں اپنی ہم جماعت انگریز لڑکی ٹریسا سے کورٹ میں شادی رچائی۔ اصلیت کا علم گھر والوں کو ہوا تو شیخ ریاض الدین کٹی شاخ کی صورت زمین بوس ہو گئے اور وفور غم میں اسی عالم میں دائمی نیند سو گئے۔ شگفتہ کو دلی دکھ ہوا۔ البتہ پریشان ہونے کے بجائے قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہو گئی۔

افتخار اعلیٰ ڈگری کے ساتھ ساتھ انگریز بیوی لیکر لوٹا اور ماں کو چھوڑ کر بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شگفتہ افتخار کی ماں کا بھی خیال رکھنے لگی۔۔۔ کچھ بہاریں آئیں اور چلی گئیں۔ ایک روز بمبئی سے اپنے رشتہ کے بھائی شہزاد کا خط شگفتہ کو ملا۔

”دیدی افتخار کی طبیعت بہت ہی خراب چل رہی ہے۔ اُس کی حالت واقعی نازک ہے۔ خسرہ نکلی ہے۔ اُس کے سارے واقف کار حتیٰ کہ بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ وہ انگلستان واپس چلی گئی ہے۔ ہسپتال میں بے سرو سامانی کی حالت میں پڑا ہے۔ لگتا ہے اُسے تمہاری بددعا لگی ہے۔“

خط پڑھتے ہی شگفتہ کی آنکھیں شدت غم سے بھر آئیں۔ اور پھر نماز عصر ادا کرنے کے بعد ایک نئے جذبے کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالا۔

”رحمن بابا ہوئی جہاز سے بمبئی کے لئے ٹکٹ بک کراؤ“

”بیٹی یہ تم کیا کہہ رہی ہو“ یہ ساس تھی

”نہیں ماں! مجھے جانا ہے۔ میں اُن کی رفیقِ حیات

ہوں۔ مجھے نہ روکو، آج اُن کو میری ضرورت ہے۔“

اگلے روز شہزادی شرکت میں ہسپتال پہنچ گئی۔

افتخار ساکت بیڈ پر پڑا تھا۔ چہرہ چھالوں سے بھرا ہوا، چوڑیوں کی کھنک اور سکیوں سے افتخار کی آنکھیں کھل گئیں۔

افتخار کی آنکھوں میں ندامت کے نقوش ابھر آئے۔ اُس کے ہونٹ ہلے

”آخر تم آگئیں شگفتہ مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم پر

ظلم کے پہاڑ توڑ دئے۔ کاش میں مرجاتا۔۔۔۔۔“

”ایسا مت کہے۔ آپ بہت جلد صحت یاب ہوں گے“

یہ کہتے ہی شگفتہ نے افتخار کا ہاتھ تھام لیا اور فرط محبت میں افتخار نے شگفتہ کے قدموں میں گر کے رونا شروع کیا۔

”افتخار ہمت سے کام لو۔ انشاء اللہ ہماری خوشیاں

لوٹ آئیں گی۔ فی الحال مجھے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے

کی مہلت دو“ یہ کہہ کے شگفتہ باتھ روم میں وضو کرنے

چلی گئی۔



جذباتی اندازِ فکر

رمضان بابا کا اکلوتا بیٹا نذیر منڈی سے سبزی خرید کے ریڑھی میں بستی بستی جا کے فروخت کرتا تھا۔ بوڑھے والدین کا واحد سہارا نذیر تھا۔ ایک دفعہ ریڑھی لیکر سبزی منڈی جا رہا تھا کہ بڑے بازار کے کٹڑ پر تیز رفتار ٹرک نے ٹکرا دی۔ نذیر بڑے پتھر سے جا لکرایا بائیں کاندھے اور کینٹی میں چوٹ آئی تھی۔ خون فوراً کی صورت بہہ رہا تھا۔

ہسپتال میں ڈاکٹروں نے خون کا بندوبست کرنے کو کہا۔۔۔ رمضان بابا بے بسی کے عالم میں رہ چلتے ایک ایک فرد سے خون کی بھیک مانگتا رہا لیکن اُس کی فریاد صدا بہ صحرا ثابت ہو گئی۔۔۔ اور نذیر بوڑھے باپ کی گود میں دم توڑ بیٹھا۔

شام کو بیٹے کو دفنانے کے بعد رمضان بابا واپس گھر آ رہا تھا کہ نیلم چوک میں کھل بلی مچی تھی۔ آج واحد میں جمع بھیڑ پر لائٹھیاں اور گولیاں برسائیں گئیں دیکھتے ہی دیکھتے سارا چوک خون میں سیراب ہو گیا۔

افسوس انسانی جان بچانے کے لئے کسی نے خون کا ایک قطرہ نہ دیا اور سیاسی و جذباتی ڈگر سے وابستہ شاہراہ کو اسی خون سے رنگین کیا گیا۔۔۔۔



ہڑتال

معمولی سے معمولی بات پر ہڑتال کا بھگل بجایا جانے لگا ہے۔ اور لگتا ہے کہ اب اس بے مطلب احتجاجی حربے کے لوگ عادی ہو چکے ہیں جب ہی اس کے خلاف کسی بھی طرح کی آواز بلند نہیں کی جاتی۔۔۔۔۔ پہلے تو خاص وجوہات کے باعث سال میں ایک دو بار ہڑتال کی کال دی جاتی تھی۔ زیادہ تر سرکاری ملازمین یا کارخانوں میں کام کرنے والے اراکین یا پھر دیگر محنت کش طبقے ہی اپنی جائز مانگیں پوری نہ ہونے کی صورت میں ہڑتال کیا کرتے تھے۔

گذشتہ تحریکی برسوں میں علیحدگی پسند ذمہ داران کی مہربانیوں کے باعث لگ بھگ سال بھر کا طویل عرصہ ہڑتالوں کی نذر ہوا۔ کسی تحریکی رکن کو نامعلوم بندوق برداروں نے موت کی نیند سلا یا تو ہڑتال، کسی بھی زعم کو ناگہانی حوادث کا سامنا کرنا پڑا تو ہڑتال اور کوئی تحریکی دلدادہ کسی واردات میں زخمی ہوا تو ہڑتال۔

حالانکہ اس حقیقت کا ہر ایک کو اعتراف کہ ہڑتالی سیاست چلانے سے فقط مفلس، لاچار، محنت کش مزدور اور یومیہ اجرت پانے والے چھوٹے ملازمین ہی اعتبار و زیاں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک سچے واقعے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں تاکہ تحریک و دیگر ذمہ داروں کو ہڑتال کے اثرات کا کچھ تو احساس ہو۔

ہوا یوں کہ علحیدگی پسند گروہ کے ایک زعمیم کے کہنے پر وادی بھر میں تین دن کی ہڑتال کی گئی۔ ہڑتال کھلنے پر چوتھے روز گھر سے چلا تو بائی پاس چوک میں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ ایک ریڈی والا دو چھوٹے بچوں کی شرکت میں زار و قطار رو رہا تھا۔ سامنے سڑھے ہوئے انگور کے تین ڈبے پڑے تھے۔

دراصل ہڑتال سے قبل ہی سویرے میوہ فروش گلزار نے میوہ منڈی سے تین پکے انگور کے ڈبے خرید لئے تھے۔ ہڑتال کی وجہ سے وہ فروخت نہیں کر سکا۔ اور انگور گرمی کی وجہ سے سڑ گئے۔ اب وہ بچوں کو کیا کھلائے اس پر ماتم کناں تھا۔

وہاں جمع شدہ افراد نے کچھ نقدی جمع کر کے گلزار کے ہاتھ میں تھما دی اور دلاسا دیا۔

میں سوچتا رہ گیا کہ ہڑتال کرانے سے گورنمنٹ یا سیکورٹی فورسز کو کون سا نقصان اٹھانا پڑتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہڑتال کی وجہ سے ایک غریب دیومیہ اجرت پانے والے افراد پر قیامت ٹوٹتی ہے۔



متضاد سوچ

کمیل والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی پرورش بہت ہی خوش گوار ماحول میں ہوئی۔ بچپن اور لڑکپن میں جس چیز کی اُسے طلب رہی بلا کسی دقت کے دستیاب رہی۔

کمیل نے زیادہ نہیں پڑھا بلکہ انٹرس پاس کرنے کے بعد ہی اپنے والد کا لمبا چوڑا کاروبار سنبھال لیا۔ شادی ایک متمول گھرانے کی قبول صورت لڑکی سے ہوئی۔ کمیل اور راحیلہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے۔ وقت گزرتا گیا۔ والدین پوتا یا پوتی کے لئے بے چینی کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ لیکن اُن کی تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اسی حالت میں بیس برس کا طویل عرصہ گزر گیا۔

اولاد کے لئے والدین نے دوسری شادی پر زور دیا۔ لیکن کمیل نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنے اور راحیلہ کے درمیان کسی دوسری ہستی کے وجود کی بابت سوچنا بھی گناہ تصور کرتا تھا۔

الغرض خاندانی وارث کی باپت کمیل کو سمجھایا گیا۔ اور پھر حالات کے زیر اثر راحیلہ نے ہی کمیل کو دوسری شادی کے لئے آمادہ کر دیا۔
عالیہ سوت بن کر گھر کو آباد کر گئی۔

راحیلہ اور عالیہ ایک دوسرے سے والہانہ پیار جتانے لگیں جیسے وہ دو بہنیں

خدا کا کرنا پھر بھی اولاد کی نعمت سے گھرانہ محروم رہا۔ وقت گزرتا گیا۔ والدین یکے بعد دیگرے دائمی نیند سو گئے۔ ادھر عمر رسیدہ راحیلہ اور جوان عالیہ کی سوچ میں تبدیلی سامنے لگیں اور وہ انداز دیگر میں سوچنے لگیں۔ عالیہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند جوان نظر آئے تو موقع پا کر وہ کمیل کے سر کے سفید بال توڑتی رہی۔ ادھر سے راحیلہ چاہتی تھی کہ کمیل اُس کی طرح بوڑھا نظر آئے۔ اس غرض سے وہ موقع پا کر کمیل کے سر کے سیاہ بال نوچتی رہی۔

راحیلہ اور عالیہ کی متضاد سوچ و فکر کے زیر اثر تھوڑے ہی عرصے میں کمیل کے سر کی کھیتی چٹیل میدان کاروپ دہار گئی۔

بوڑھی راحیلہ اور جوان عالیہ کے مابین کمیل کی حالت ایک جراب سے کم نہ تھی۔ اوپر پاؤں نیچے بوٹ اور درمیان میں موزہ کی حالت ناگفتہ بہہ۔



اپنا پرایا

فیاض پیشہ سے سول انجینئر ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے اور ماں کے بے جا لاڈ و پیار کے باعث وہ لڑکپن سے ہی لا اُبابی پن اور سرکش طبیعتی کا دلدادہ بنارہا۔ اس قدر ضدی کہ جس چیز کی طلب رہی وہ کسی بھی صورت میں حاصل ہو۔ ورنہ چلا چلا کے آسمان سر پر اٹھائے۔

جان پہچان والوں نے صلاح دی کہ از دو اجی زیست کی لذت سے مستفید ہونے کے بعد فیاض کے مزاج میں تبدیلی سما جائے گی اور اُسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔ والدین نے اپنے رشتے کی لڑکی ذاکرہ کا انتخاب بطور بہنو کر لیا۔ لیکن فیاض نے خلاف امید عین وقت پر والدین کی چاہت کو خاطر میں نہ لائے بتول نامی قبول صورت اور خُود سر لڑکی کو عدالت کی وساطت شریک زیست کا درجہ بخشا۔

ڈیوٹی گھر سے دُور پہاڑی علاقے میں تھی۔ اور کچھ برس کے بعد ٹرانسفر ہو کے فیاض گھر واپس آ گئے تو عالیہ کے نام سے ایک ننھی گھڑیا بھی ساتھ میں تھی۔ اب تو عالیہ تیسری جماعت میں پڑھتی ہے۔ نہایت ہی حساس اور ذہین لڑکی ہے۔ بلا کی زیر کی پائی ہے۔ اہل نوعمری میں بھی دادا کے ذہن میں ابھرنے والی کہانی کے چند نکات بغور سن لیتی ہے اور معصومانہ انداز میں کہانی کو نیا موڑ دینے کی نیت سے تھوڑا بڑ پیش کرتی ہے۔ دادا نے

عالیہ کے مشوروں کو اکثر بر محل جان کے اپنایا ہے۔

بتول کا ہاتھ بٹانے اور گھڑباغچے میں کام کرنے کی غرض سے ایک بارہ سالہ پہاڑی لڑکے عمران کو فیاض نے گھر لایا۔ عمران بہت ہی ہوشیار، پھرتیلا اور حاضر جواب تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اُس نے سارا کام سنبھالا۔ اور ہر ایک کے دل میں اپنے لئے جگہ بنانے میں کامیاب اُترا۔

اب سب ہی اُسے نام کے بجائے ”بیٹا“ کہہ کے یاد کرنے لگے۔۔۔۔۔ عمران کا گھر میں آنے اور اُسے ”بیٹا“ کے نام سے پکارنے سے عالیہ کے مزاج میں تبدیلی سامنے لگی۔ یہ جانے کیوں اُس کی نظروں میں عمران کھٹکنے لگا۔ کوئی نہ کوئی شکایت لیکر دادا کے پاس جاتی۔

”دادو یہ عمران بڑا کام چور ہے۔ دن بھر میری

چیزوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اُسے تمیز نہیں“

”عالیہ بیٹا! عمران بھی تو چھوٹا ہی ہے۔ وہ بھی کسی کالا ڈلا بیٹا ہے۔ غریب ہونے کے باعث ہمارے یہاں کام کرنے پر مجبور ہے۔ اُس سے نفرت جتنا اچھا نہیں۔“ دادا نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پر دادو! سب نے بیٹا بیٹا کہہ کے اُسے سر پر چڑھایا

ہے۔۔۔ دادو اپنا اپنا ہی ہوتا ہے۔ پرایا کبھی بھی اپنا نہیں

بن سکتا۔“

عالیہ کی وزن دار باتوں نے دادا کو لا جواب کر دیا۔ گو عالیہ کو سب نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن لحظہ بہ لحظہ اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن سامنے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ

مما پاپا اور دادا دادی کا پیار جو صرف اُس کے لئے وقف ہے عمران کے آنے سے بٹ کے رہ گیا ہے۔

عالیہ کے کرخت پن اور ٹرٹش روی میں اضافہ ہونے لگا اور اُس کی صحت بھی گرنے لگی۔۔۔۔۔ اب تو اسکول کا کام کرنے اور مکتب جانے سے بھی جی پُجانے لگی۔ بتول کو اور فکر لاحق ہوئی جب کلاس ٹیچر نے جتا دیا کہ ”عالیہ اب پڑھائی میں کم دل چسپی لینے لگی ہے۔ اور زیادہ تر پُپ چاپ سوچا کرتی ہے۔ کچھ بتاتی بھی نہیں“ دادا نے عالیہ کا ذکر فیملی ڈاکٹر الطاف سے کر دیا تو اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ نفسیاتی مرض کا ہدف بنے عالیہ کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ عمران اُس کی پیار بھری نگری میں نفرت اور بدگمانی سے لبریز حالات رونما کرنا چاہتا ہے۔

الغرض ڈاکٹر کے مشورہ کے تحت عمران کو واپس اُس کے گھر روانہ کیا گیا۔ اور بدلے میں پاس والے گاؤں کی عمر رسیدہ خاتون کو گھریلو کام کے لئے رکھا گیا۔ آہستہ آہستہ عالیہ کے مزاج میں متوازن و خوشگوار تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ اُس کی ٹرٹش روی اور ضدی پن بدلنے لگا۔ اب وہ بالکل نارمل لگ رہی ہے اور دل جمعی کے ساتھ درسی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں ماما کا ہاتھ بٹاتی ہے اور پہلے ہی کی طرح دادا کی کہانیوں میں نیا موڑ دینے کی بابت اپنے ننھے منے خیالات کا اظہار کرنے میں پیش پیش رہتی ہے۔



کوتاہ اندیش

دفتر سے گھر واپس آرہا تھا کہ بائی پاس چوک کے نکل پر ایک شخص کو بارہ سالہ بچے کو پیٹتے دیکھا۔ لڑکا زار و قطار رو رہا تھا۔ سامنے جا کے اصلیت جاننے کی کوشش کی۔
 ”بچے کو کیوں مارتے ہو“

”یہ نالایق میرا بیٹا ہے۔ ابھی سے نشلی سگریٹ پینے لگا ہے۔ آج میں نے اس کم بخت کو سگریٹ پیتے پکڑ لیا“
 ”لیکن یہ عادت اُسے کیسے پڑ گئی اور یہ سگریٹ اُسے ملی کہاں سے۔ یہ تو پوچھنا تھا“

میری رگ تجسس جاگ اٹھی،

”سنا ہے کہ اسکول کے باہر کوئی آدمی یہ نشلی چیزیں فروخت کرتا ہے“
 ”بہتر رہتا کہ اُس شخص کو پولیس کے حوالے کیا جاتا اور
 ہاں رقم اسے کہاں سے ملتی ہے“ میں نے لقمہ دیا۔

”دیتی ہوگی ماں! اُس کے لاڈ نے بگاڑ کے رکھا ہے“

اتنا کہہ کے وہ بچے پر پھر ہاتھ اٹھانے لگا تو میں نے سختی سے سمجھانے کی سعی کی۔
 ”دیکھئے لڑکے کو مارنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔“

پیار و محبت کے ساتھ اسے بتا دیجئے کہ اس فعل میں کتنے
مُضر اثرات پنہاں ہیں۔ اور اسے گھر میں صاف ستھرا
ماحول فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کیجئے۔“

یہ سُنتا تھا کہ متذکرہ شخص لڑکے کو اسکوٹر کے پیچھے بٹھائے نظروں سے اوجھل
ہو گیا۔

اگلے روز روزنامہ ”آفتاب“ میں یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی کہ پولیس نے رات دیر
گئے ”ولددار ہونٹل“ میں چھاپہ مار کے منشیات کا دھندہ کرنے والے تین افراد کو حراست میں
لیا ہے۔ خبر کے ساتھ جو فوٹو چھپی تھی اُس میں ایک اُس شخص کی تھی جو اپنے بیٹے کو سرِ راہ
پیٹ رہا تھا۔

واہ رے حضرت انسان کی یہ کوتاہ اندیشی!۔



گھناونی تصویر

عقیلہ بیوگی کا لباس زیب تن کئے کچھ دنوں سے بیمار پڑی ہے۔ پاس ہی سات سالہ ناصر غم گین ورنجیدہ صورت بیٹھا ہے شریک حیات کی موت کے بعد عقیلہ پاس میں مولوی صاحب اور خان صاحب کے گھر میں صفائی کرنے کے عوض کچھ نقدی پائے بچے کو پالتی تھی۔

”بیٹا یہ لو تمہارے ابو کے پرانے اخبارات و جرائد اسے ردی میں فروخت کر کے کچھ کھانے کے لئے لے آؤ“

ردی کا بنڈل کریمانہ فروش کی جانب بڑھا دیا۔
کریمانہ فروش نے ردی کا بنڈل لئے ناصر کی جانب اندازہ دگر میں گھورا اور بڑبڑایا۔

”ابھی بکری ہوئی نہیں اور یہ لوٹنڈا آگیا اپنا چمک کیش کرانے“
ناصر نے عاجزی سے کہا

”ماں کچھ دنوں سے بیمار ہے کچھ کھانے کو نہیں آپ چار آنہ کلو قیمت کم ہی دو مگر بنڈل رکھ دو“۔

کریانہ فروش ردی کا پلندہ تولنے لگا کہ اتنے میں اسکوٹر پر سوار ایک پندرہ سالہ خوش باش لڑکے نے چلا کر کہا۔

”کا کا مجھے جلدی ہے۔ جلدی سے گولڈ فلیک

پاکٹ، امول چاکلیٹ اور ہائیڈ اینڈ سیکسٹ دیدو۔“

اس کے ساتھ ہی ایک سوکانوٹ دکاندار کو تھما دیا اور خود سگریٹ سلگائے دھوئیں کے مرغولے اڑانے لگا۔ لڑکے کے جانے کے بعد کریانہ فروش نے کچھ ریزگاری ناصر کو ردی کے بدلے میں دی۔

ناصر نے ڈبل روٹی اور دودھ کا پاکٹ خرید کے گھر کا رخ کیا۔ وہ مرے مرے قدموں کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ تفریق کی کتنی گھناونی تصویر ہے کہ ایک گھر میں کھانے کو اناج کا دانہ تک نہیں اور دوسرے گھر میں دولت کی اتنی فراوانی کہ کم سن بچے تک داؤ عیش لے رہے ہیں۔



عقاب زدہ

دن کے نوجبختے کو تھے۔ راستوں پر بھیڑ بڑھنے لگی تھی۔ دسمبر کے آغاز کی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سارا ماحول ٹھہرا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ راشد اندازِ بے نیازی سے اپنے لائے ڈھیلے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور کانوں و گردن سے ایک بوسیدہ مفکر لپیٹے تیز رفتاری کے ساتھ سڑک کے کنارے جارہا تھا۔ جیسے موسم کی سختی کو اُس نے اپنی زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہو۔

راشد فرنیچر بنانے کے کارخانے میں یومیہ اجرت پر کام کرتا تھا۔ کارخانہ صبح آٹھ بجے کھلتا اور شام پانچ بجے تک کام چلتا رہتا۔ یہ سلسلہ سال بھر یکساں رہتا تھا۔ آج پھر راشد کو دیر ہو گئی تھی۔ لیکن وہ کربھی کیا سکتا تھا۔ حالات سے مجبور تھا۔ ماں مہینوں سے بسترِ مرض پر دراز اور اتنا سرمایہ دستیاب نہیں کہ اُس کا ڈھنگ سے علاج ہو سکے۔ رات سے طبیعت زیادہ خراب چل رہی تھی۔ ڈاکٹر اشفاق نے ملاحظہ کرنے پر کچھ دوائیاں لکھ دیں اور ساتھ میں ہسپتال لے جانے کی صلاح بھی دی۔ ماں کے علاوہ چھوٹی بہن ناظمہ جو ماں کی تیمارداری کے علاوہ گھر کا کام کاج سنبھالتی ہے۔

سٹھر روپے راشد کو یومیہ اجرت مقرر تھی۔ جس میں کھانے پینے کے اخراجات بہ مشکل پورے ہو پاتے تھے۔ صبح ناشتہ سے فارغ ہوئے ناظمہ نے معصومیت سے کہا تھا

”بھیا! راشن ختم ہونے کو آیا ہے۔ واپسی پر ماں کی دوائی اور ڈنبل روٹی ضرور لے آنا۔“

راشد سوا گھنٹہ دیر سے کارخانہ پہنچا اور جلدی سے کوٹ اُتار کر کام میں جھٹ گیا معا کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”راشد تمہاری ڈیوٹی کا کیا ٹائم ہے؟“

راشد نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ولیم سیکشن انچارج اُسے شعلہ بارنگا ہوں سے گھور رہا تھا۔

”جی آٹھ سے پانچ تک۔“ راشد نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس وقت سوا نو بج رہے ہیں۔ تمہیں سوا گھنٹہ مزید کام کرنا پڑے گا ورنہ مزدوری کم ملے گی۔“

”حضور میری ماں زیادہ بیمار تھی۔۔ اُسے ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ انچارج شیکشن جا چکا تھا۔ اور راشد کی آواز کارخانے میں نصب مشینوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔

اتنے میں اُس کے بازو والا مشین مین کرتار اُسے مخاطب ہوا

”ولیم بابو کے کانوں میں راشد بھیا فقط مشینوں کی آواز ہی پہنچ سکتی ہے۔

ہمارے زخمی دلوں کی آہ اُس کی سماعت کی بلندیوں کو نہ پاسکے گی۔ ظلم اور بے انصافی کے اندھیرے تو ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔ حالیہ ترقی یافتہ دور میں بھی ہماری خوش حالی کی راہیں مسدود ہیں۔۔۔ لیکن وہ دن دُور نہیں جب واہِ گر کو کی مہربانی سے بہتری و بہبود کی شاہراہیں ہمارے لئے کھل جائیں گی۔۔۔ آج سوا گھنٹہ لیٹ سہی۔ ہمت سے کام لو۔“

راشد سر جھکائے ساتھی کی باتیں سننا رہا۔ اور نگاہیں اٹھائے بولا
 ”کیا بتاؤں کرتار میرے ساتھ کتنی پریشانیاں ہیں۔ آج ماں کی حالت نہایت
 ہی ابتر لگی۔ اُس کی دوائی۔۔۔“

”میں سب کچھ سمجھتا ہوں راشد“ کرتار نے بات کاٹے اپنائیت بھرا لہجہ اپنایا۔
 ”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں خوش ہوں ارے باپو ہسپتال میں
 پڑا ہے۔ بیٹے کلونٹ کو اسکول میں داخل نہیں کر پاتا۔۔۔۔۔ ہماری طرح نہ جانے کتنے
 لوگ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔۔۔ تم نے کچھ لوگوں کو فٹ باتھ پر دیسی
 شراب کے جام چڑھا کر قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ لیکن اُن کے دل بھی یاسیت سے
 لبریز ہوتے ہیں۔ اُن کی روح کی رکاریوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تمہیں
 کچھ خستہ دل ساتھی بازارِ حُسن کی روشن گلیوں میں چکر لگاتے نظر آئیگئے لیکن ذرا اُن کے
 گھروں پر نظر ڈالو وہاں تمہیں تاریکیوں اور آہوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔۔۔ کیا کریں لگتا
 ہے یہ اس جہاں کا دستور ہے۔ اب دیکھو نا ہم جی تو زُحمت کرتے ہیں اور کارخانے کا سیٹھ
 عیش کر رہا ہے۔ ہم چیزیں تیار کرتے ہیں اور مالک کی تجوریاں بھر جاتی ہیں۔ گوکارخانے
 ہمارے دم سے ہیں اور زندگی کی سریتیں ہم سے دُور ہیں۔۔۔ راشد: دراصل ہم غریب
 لوگ مصیبتیں جھیلنے اور مایوسیوں کو گلے لگانے کے لئے ہی اس دنیا میں آئے ہیں۔ دل
 چھوٹا نہ کر کے میں اپنے تمام حالات واہ گرد پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ہم جگ کے داتا کے آگے
 بے بس ٹھہرے۔“

اتنا کہہ کر کرتار خاموش ہو گیا۔ راشد نے غایرانہ نظر اُس پر ڈالی اور کام میں
 جھٹ گیا۔

کارخانے میں چھٹی کرنے کی گھنٹی بجی۔ بہت سے ساتھی کام ختم کر کے کارخانے سے نکلنے لگے البتہ کچھ لوگ بدستور مشینوں سے اُلجھے ہوئے تھے۔ یہ وہ مزدور تھے جو راشد کی طرح دیر سے کام پر آئے تھے۔ گویا اپنا وقت پورا کر رہے تھے۔

”ساڑھے چھ بج گئے راشد“ یہ عبدل کی آواز تھی۔

راشد نے مشین کا سوئچ آف کر دیا۔ اور سامنے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔۔۔

دُور دُور تک ساری بستی پر دُھند سی چھانے لگی تھی۔ ماں کا خیال اُسے ستانے لگا۔ ٹائم کیپر سے دن بھر کی مزدوری کی رقم حاصل کئے وہ کارخانے کے احاطے سے باہر آیا۔ کرتار اُس کے اُٹار میں تھا۔

”تم ابھی گھر نہیں گئے کرتار“

”سوچا آج تمہاری ماں کی خیریت دریافت کروں۔“

”تم کس قدر عظیم انسان ہو کرتار“۔ راشد کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

”کون ہوتے ہو تم میرے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ خلوص و اپنایت کسی ایک کی جاگیر نہیں۔ اور اِس طرح کے مروت بھرے جذبات غریبوں کے دلوں میں ہی پلتے ہیں۔ میں تمہارا شکر یہ کیسے ادا کروں۔“

”ارے کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو راشد۔ محبت و دوستی کی بے لوثی کسی شکر یہ

کی محتاج نہیں ہوتی۔ دراصل خلوص و ہمدردی پر پست طبقہ کے ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔“

الغرض بازار سے کچھ سودا اور میڈیکل اسٹور سے ماں کی دوائی خرید کے تیز قدموں کے ساتھ دونوں گھر کی جانب دوڑ پڑے۔ بہن ناظمہ کو گھر کے احاطے میں منتظر

پایا۔

”بھیا آج زیادہ ہی دیر کر دی۔“ ماں کو نیند لگی ہے۔

راشد نے تھیلہ ناظمہ کو تھما دیا اور کرتار کے ہمراہ ماں کو دووائی پلانے کی غرض سے کمرے میں گھسا۔ کمرے میں چراغ کی روشنی جیسے کانپ رہی تھی۔ بے تابی کے ساتھ راشد نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ لیکن پیشانی پر ف کی مانند سرد تھی۔ پھر بوکھلا کر راشد نے ماں کا تمام جسم ٹول ڈالا۔ لیکن وہاں کیا تھا بے رُوح جسم البتہ ہونٹوں پر ابھری مسکراہٹ جسے زندگی میں لاکھوں آرزوؤں کے بعد بھی وہ حاصل نہ کر سکی تھی۔
کرتار نے بڑھ کر راشد کو سہارا دیا۔



واپسی

زرینہ جنسی خیانت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ دراصل اُس کا شوہر عاصف ایک مصروف عہدہ پر فائز تھے۔ سگریٹ نوشی کے علاوہ شراب پینے کا عادی۔ سرکاری ذمہ داری نبھانے کے بعد گھر آنے کے بجائے اکثر کلب کا رخ کر لیتے جہاں ہم خیال احباب کی صحبت میں باون پتوں کی اٹھک بیٹھک کے ساتھ ساتھ شراب کے دور چلتے اور رات کا خاصہ حصہ یونہی گذر جاتا۔

گھر واپس آنے پر خادم کو اپنا منتظر پاتا اور بسا اوقات کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی پلنگ پر دراز ہو جاتے جہاں زرینہ کے خراٹوں سے اُس کا سواگت ہوتا۔ گویا عاصف اپنے حال میں مست شریک حیات کی جنسی ضروریات پورا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ زرینہ کو جنسی راحت و سکون حاصل کرنے کی خاطر اندازِ دیگر میں سوچنا پڑا۔ ویسے زرینہ عمر میں بھی عاصف سے قریب اَدس برس چھوٹی تھی۔

کچھ مدت اسی حالت میں گذرنے پر زرینہ کا ضمیر اس خیانت و بے وفائی پر اُسے ملامت کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ احساسِ گناہ بڑھتا گیا اور زرینہ کا ذہنی سکون درہم برہم ہونے لگا۔ وہ اپنے وجود کو حقیر سمجھنے لگی۔ زرینہ کا یہ احساس اس قدر بڑھا کہ اپنی اکلوتی بیٹی شیرین کو بھی پیار کرنے سے ہچکچانے لگی۔ کبھی اس خیال سے کہ ”کل کو وہ بھی اس فعلِ بد میں ملوث نہ ہو جائے“ زرینہ تڑپ کے رہ جاتی۔ وہ آرام سے سو سکتی نہ ہی اطمینان کے ساتھ گھریلو امور ات بجالاتی۔

افرا تفری کے عالم میں غلطاں اُس نے آخر کار عہد کر لیا کہ وہ اپنائی جانے والی

فاش غلطی سے باز آئے گی۔ شب جمعہ مقامی خانقاہ میں حاضری دے اُس نے عہد کر لیا کہ وہ بدیانتی کی ڈگر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناطہ توڑ دے گی۔ چاہے بدلے میں اُسے کتنی ہی کوفت سہنی پڑے۔

کچھ مدت پاک و صاف حالت میں گزارنے کے بعد بھی زرینہ کا ضمیر اُسے برابر کوستار ہا۔ آخر کار اُس نے طے کر لیا کہ وہ اپنائی گئی بے وفائی کی داستان اپنے شوہر کے گوش گزار کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لے گی۔ ذہنی کوفت سے نجات پانے کی نیت سے وہ شریک حیات کے سامنے اعتراف گناہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔۔۔ وہ خوفزدہ تھی۔۔۔ کبھی یہ ڈر کہ عاصف اصلیت جان کر اُسے جان سے مار ڈالے گا۔ کبھی یہ خدشہ کہ طلاق دے گا۔ ایسا ہوا تو شیریں سے بھی الگ ہونا پڑے گا۔ اس سب کے لئے زرینہ ہر گز ہر گز تیار نہ تھی۔

ایک روز طبیعت ناساز ہونے کے باعث عاصف جلدی گھر آ گئے۔ زرینہ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے عاصف کے سرہانے بیٹھ گئی۔ ہمت خوف پر غالب آ گئی۔ عاصف کا سرد باتے ہوئے زرینہ نے نہایت ہی مخلصانہ انداز میں اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ عاصف سب کچھ سُن کے خاموش رہا۔ اور پھر خلاف توقع ہفتوں یہ خاموشی کا سلسلہ طاری رہا۔ اس جانکاہ و طویل خاموشی نے زرینہ کو حیرت میں ڈال دیا۔ طرح طرح کے دوسے اور خیالات اُس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ وہ تجھے تجھے دل کے ساتھ واجبات ادا کرتی رہی۔ زرینہ کی حالت ابتر، بے چینی اور کرب نے اُسے بُری طرح سے ستانا شروع کر دیا۔

اچانک ایک روز دفتر جاتے ہوئے قفل سکوت توڑتے ہوئے عاصف نے

زرینہ کو اپنے پاس بلایا اور برملا کہہ دیا۔

”فعل بد کے لئے میں نے تمہیں معاف کر دیا۔“

زرینہ کے تن من میں بشاہت کی کرن پھوٹ پڑی۔ کردگار کا شکر بجالائے اُس نے نماز شکرانہ بھی ادا کر دی۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بیت گئے۔ لیکن عاصف کے معمولات میں کسی طرح کا بدلاؤ دیکھنے کو نہیں ملا۔ گویا یہ خوشی زرینہ کے لئے عارضی ثابت ہوئی۔ اُسے یقین تھا کہ جرم کا اعتراف کرنے کے بعد عاصف اور اُس کے مابین فاصلہ کٹ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب زرینہ کے دل میں خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی حقارت کا احساس اُبھرنے لگا۔ البتہ اس بار اپنے کو نہیں بلکہ عاصف کو حقیر سمجھنے لگی۔

زرینہ طرح طرح کے سوچوں میں گم۔ لگتا ہے کہ اعتراف گناہ پر شوہر نے دل کے بجائے زبان سے ہی معاف کر دیا ہے۔۔۔ کسی طرح کی ناراضگی کا اظہار تک نہیں کیا۔۔۔ مجھ پر ہاتھ بھی نہیں اٹھایا اور نہ ہی طلاق دینے کی دھمکی دی۔

لحظہ بہ لحظہ عاصف کے لئے حقارت و نفرت زرینہ کے دل میں بڑھنے لگی۔ اُس نے اپنے وجود کو بے چینی و بے قراری کے بحر بے کران میں غوطہ زن پایا۔

بہت سوچنے اور غور کرنے کے بعد زرینہ کے لئے ضروری بن گیا کہ وہ ایک ایسا حل تلاش کر لے تاکہ وہ اس شدید کرب و بے قراری سے چھڑکا رہا سکے۔

الغرض زرینہ نے خوب سوچا!

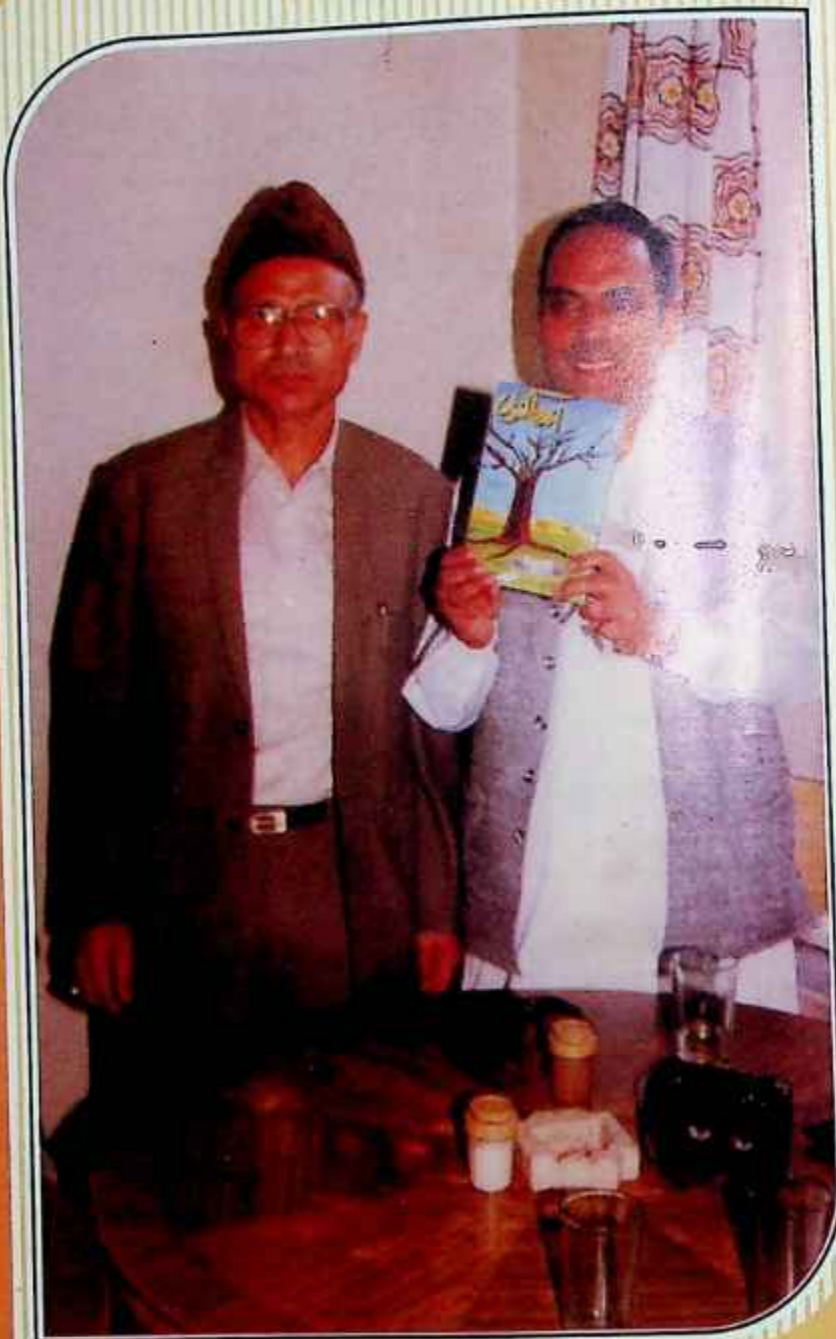
آخر کار دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُس نے وہ حل نکالا۔

وہ پھر سے جنسی بے راہ روی کی راہ پر لوٹ آئی۔



ہمارے بھی ہیں مہربان -----

مرحوم حکیم منظور احسن ساہو (مڈھا کنواں کے رسم رونما کی پر)



حسن ساہو کے افسانے اور مضامین برسوں سے پڑھتا آیا ہوں۔ وہ ایک کہنہ مشق، ممتاز اور جاندار قلم کار ہیں جس نے ادبیات اور صحافت میں نام پیدا کیا ہے۔

آس پاس کے واقعات و حادثات سے متاثر ہو کر اُن کو افسانوی روپ دینے میں اُن کو زبردست مہارت حاصل ہے حسن ساہو کے اکثر مختصر افسانے وطن اور سماج کے احساسات کو بیدار کرنے میں کامیاب نظر آ رہے ہیں۔
خدا کرے زور قلم اور زیادہ

(مکتوب ۱۶، اکتوبر ۱۹۸۵ء)



مظہر امام (دہلی)

آپ کے افسانے باقاعدگی سے رسائل میں دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے ماہنامہ ”تعمیر“ میں شائع شدہ آپ کے افسانوں کی اُن دنوں تعریف کی تھی۔۔ آپ کے کئی افسانے پسند آئے۔ آپ کا فن روبہ ارتقا ہے اور آپ کے ہاں تحکین کے آثار نہیں ہیں۔

(مکتوب ۱۵، اگست ۲۰۰۱ء)



آنجھانی آفند بخشی (بہی)

آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ آپ کے افسانوں میں سچائی ہے اور انسانیت کی رفق آپ کا افسانہ ”مندرسے مسجد تک“ دل کو چھو گیا!

(مکتوب ۲۶، اپریل ۱۹۹۸ء)



پروفیسر فضل امام رضوی (لکھنو)

”اندھا کنواں“ تخلیقی فن کا عمدہ اور بہتر نمونہ ہے۔

حسن ساہو نے اپنے قلم کی جولانیوں سے موضوع کو کامرانیوں تک پہنچایا ہے۔ وہ ایک مشاق قلم کار ہے۔ افسانوی ادب کے رموز و نکات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس ادب پارے میں بھی انہوں نے فنی توانائیوں کے جلوہ صدرنگ پیش کئے ہیں۔ اس کامیاب و نتیجہ خیز کاوش پر میں انہیں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

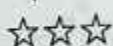
(مکتوب ۶، اگست ۲۰۰۲ء)



ہمد م کاشمیری (سرینگر)

حسن ساہو کا اسلوب اور اپر وچ روایتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں کہانی پن اور جزئیات نگاری دیکھی جاسکتی ہے اُن کے موضوعات سامنے کے کردار جانے پہچانے اور زندگی کے قریب ہوتے ہیں۔

(مکتوب ۳۱ مئی ۲۰۰۴ء)



ڈاکٹر اکبر حیدری (سرینگر)

ساہو صاحب ہر فن مولا ہیں۔ وہ ایک خاموش ادیب، سماجی کارکن اور ایک اچھے مقرر ہیں۔ باصلاحیت اور ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔۔۔۔۔ کچھ افسانے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مختصر افسانہ نگاری میں ساہو صاحب ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے مکالمے اور کردار ہم جیسے ہیں یعنی ہمارے معاشرے کے افراد، ہر افسانے کا پلاٹ مربوط ہے اور فنی زبان شیریں اسلوب بیان دلکش اور دل آویز۔

(مکتوب ۱۸، اکتوبر ۱۹۹۴ء)

مرحوم حکیم منظور (سرینگر)

چالیس برس سے حسن ساہو اُردو ادب کی خدمت کرتے آئے ہیں شان سے لکھتے ہیں اور چھپتے ہیں۔ حسن ساہو کے فن کے بارے میں مختصر یہ کہوں گا کہ اس طویل عرصہ میں اُن کا اپنی زمین سے رشتہ روز بہ روز گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کی (Commitment) اپنی سرزمین اور لوگوں سے بڑھتی گئی ہے۔ اسلوب اور ٹرینڈ کے اعتبار سے اُن کے افسانے مکمل ہیں۔ اُن کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں جو کلیدی کردار ہوتا ہے وہ کتنا ہی افسردہ و غم زدہ کیوں نہ ہو اس کے باوجود وہ پڑھنے والے کو زندگی کے مثبت پہلوؤں اور پُر کیف لمحات کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ حسن ساہو کے جتنے بھی افسانے ہیں وہ کسی نہ کسی انسانی اقدار کے گرد گھومتے ہیں۔

(رسم رونمائی ”اندھا کنواں“ ۱۲، ستمبر ۱۹۹۶ء ہفت روزہ ”جبروت“)



غلام نبی خیال (سرینگر)

حسن ساہو نصف صدی سے لکھتے آئے ہیں وہ ایک کہنہ
مشق قلم کار ہیں اور انسانی قدروں کو اجاگر کرنے میں ہی یقین
رکھتے ہیں۔ اُردو زبان پر انہیں خاصہ عبور ہے He is a

quite and composed writer

(ہفتہ روزہ ”وَأَسْ آف امریکہ“ مورخہ ۲۳/۱۹ نومبر ۲۰۰۳ء)



وجیہ احمد اندرابی (سرینگر)

حسن ساہو صحافت اور ادب دونوں میدانوں کے شہسوار ہیں۔
اس پر آشوب دور میں جبکہ حسن ساہو نے صحافت کا پیشہ اپنایا ہے
اور اس پیشے میں زیادہ تر وقت درکار ہے ان حالات میں کہانیاں
لکھنا کارئے دارد والا معاملہ ہے انہوں نے اس کارنامے کو
بخوبی انجام دیا ہے

(ہفت روزہ ”جبروت“ ۱۲، ستمبر ۱۹۹۶ء)



مرحوم عمر مجید (سرینگر)

حسن ساہو ریاست جموں و کشمیر کے ایک منفرد اور منجھے ہوئے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعہ ”اندھا کتواں“ کو شایان شان پزیرائی ملی ہے۔ حسن ساہو اپنے افسانے اور اُن کے کردار سماج سے اخذ کرتے ہیں۔ لہذا اُن کے افسانے براہِ راست زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں سے تعلق رکھتا ہے اور ادب میں صرف ”اچھے ادب“ میں یقین رکھتے ہیں۔ اچھا ادب جو زندگی کا ضامن ہے۔

(روزنامہ ”آفتاب“ سرینگر، ۵ مئی ۲۰۰۷ء)



آنجھانی موہن یلور (جہوں)

حسن سا ہوا ایک چُپا چُپا فنکار ہے۔ اُس کی تحریر میں
شونہی بھی ہے اور رنگینی بھی، جدت بھی ہے اور ندرت
بھی۔ اُس کے افسانوں میں محبت کے سوتے پھوٹتے
ہیں۔ اور قوس قزحی عشق جھلکتا ہے۔ وہ بہت کم لکھتا ہے
مگر خوب لکھتا ہے اُس کو افسانے کے فن پر مکمل عبور
حاصل ہے اُسے پلاٹ کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہنا
پڑتا ہے بلکہ اُن کے گزردنواح میں پلاٹ تیلیوں کی طرح
منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ جب چاہے انہیں اپنی تحریر میں
قید کر لیتے ہیں۔

(تبصرہ ”پھول کا ماتم“ افسانوی مجموعہ)



حسن ساہو ایک ایسا فن کار ہے جس نے حقیقت کو
افسانوں کا موضوع قرار دیا۔ اور فن کو سچ بولنا سکھایا۔ جس ماحول
میں پرورش پائی، مشاہدہ کیا، تجربہ کیا اور ٹولا اُس کو قلم بند کیا۔
پرستانوں کے خیالی قصوں سے دور اس دنیا کے واقعات پیش کئے
جس میں وہ رہے۔ غریب کسانوں، غم زدہ مزدوروں، بے بس
لاوارث بچیوں اور مظلوم عورتوں کی درد کی داستان اُن کے
افسانوں کا حصہ ہے۔

(مکتوب بنام زاہدہ تقدیس فردوسی)

جبل پورہ، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

☆☆☆

وریند پٹواری (دہلی)

آپ کی کچھ کہانیاں پڑھ چکا ہوں جنہوں نے فنی اعتبار سے
متاثر کیا ہے۔

(مکتوب ۲۱، اگست ۲۰۰۲ء)

☆☆☆

عبدالغنی شیخ (لیہہ لداخ)

”اندھا کنواں“ کی چند کہانیاں پڑھیں۔ اچھی کہانیاں ہیں۔ پلاٹ، ٹکلیک، زبان اور اسلوب کے اعتبار سے کہانیاں اچھی لگیں۔

(مکتوب ۲۵، فروری ۲۰۰۲ء)

☆☆☆

دیپک برکی (سرینگر)

آپ کی کہانیوں میں ترقی پسندی کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ افسانوں کی زبان سلیس اور رواں ہے اور ایسا نہیں لگتا کہ اپنائی گئی زبان میں کہیں (Jerks) لگتے ہوں۔ پلاٹ اور منظر کشی بھی خوب کی گئی ہے کرداروں کا چناؤ اور ان کا (Portrayal) فنی خوبیوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔۔۔ آپ اپنی تحریروں کے ذریعہ نبی نوع انسان کو سدھارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ بجائے مبلغ کے صرف ادیب رہنے کی کوشش کرتے تو سونے پر سہاگہ کا اثر ہوتا۔

(مکتوب ۳، ستمبر ۲۰۰۱ء)

☆☆☆

ڈاکٹر رینو بھل (چندی گڑھ)

حسن ساہو اردو ادب کا نمایاں و معتبر نام ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی مجبوزیاں، ذمہ داریاں، خوشیاں، غم، رنجشیں، خواہشیں اور مختلف رنگوں کے جذبات سے سج کر قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ زبان و بیان سلیس اور دلکش ہے۔ پلاٹ عام زندگی اور اُس کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اور معاشرے کے نظام کو قاری کے روبرو کرتے ہیں۔ غرض حسن ساہو کو دل چسپ اور دلکش افسانہ لکھنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔ اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں اور اسلوبیاتی خصوصیتوں کی میں قدر کرتی ہوں۔

(مکتوب ۵، ستمبر ۲۰۰۵ء)



ڈاکٹر ادیب سرن ارمان (مراد آباد)

حسن ساہو شہرت کے پیچھے کبھی نہیں بھاگے، وہ مقصدیت کے قائل ہیں اور اسی کے پیش نظر افسانوی ادب کی تخلیق میں سرگرم عمل رہے۔ وہ معصوم بچے کی طرح سچ بولنے والے فنکار ہیں۔۔۔۔۔ اُن کے افسانے روزمرہ کی چلتی پھرتی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے دورانِ ملازمت استحصال، بے انصافی، بے مروتی، رشوت ستانی، حق تلفی، افسراں کی بے جا من مانی اور مظالم سے مجروح سماجی بدحالی قریب سے دیکھی ہے۔ اُنہیں انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔ جب وہ کسی منظر یا واقعہ کی تصویر کشی کرتے ہیں تو قاری اپنے وجود میں کردار کا درد محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی سچے اور اچھے فنکار کی پہچان ہے۔ میرے خیال سے ساہو بہترین افسانہ نگار ہے۔

(مکتوب ۱۷- اکتوبر ۲۰۰۳ء)



مرحوم صوفی محی الدین (سرینگر)

حسن ساہو اُردو افسانہ نویسوں میں دوسرے دور سے
تعلق رکھتے ہیں اُن کے لکھنے کا زمانہ کافی طویل ہے۔
افسانوں کے تقسیم اور اُن کے موضوع کئی دہائیوں کے
واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ افسانہ ”اندھا کنواں“
میں ملک کے تقسیم کے دور میں پیش آمدہ واقعات کی حسین
پیرایہ میں عکاسی کی ہے۔ دوسرے افسانوں میں سماجی
مسائل کو بہت خوبصورتی سے اُبھارا گیا ہے۔
ساہو صاحب کے افسانے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ
ایک بیدار ذہن انسان ہیں وہ بد صورتی میں خوبصورتی
تلاش کرتے ہیں۔

(ادارہ روزنامہ ”سرینگر ٹائمز“ ۲۵ جولائی ۱۹۹۹ء)



مرحوم پروانہ ردولوی (دہلی)

مختصر طور حسن ساہو کے افسانوں کے تعلق سے میری
یہ رائے ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے واقعات اور حالات کو
کہانیوں کا رُوپ دیتے ہیں۔ وادی کشمیر میں اُردو کے
بہت سے شاعر وادیب ہو چکے ہیں اور آج بھی ہیں۔ مگر
افسانوی ادب میں حسن ساہو کا پلڑا بھاری ہے۔

(مکتوب یکم اکتوبر ۲۰۰۲ء)



ڈاکٹر محمود شبیح (جبل پور)

حسن ساہو کے بھی کردار انسانی زندگی کا ایک فطری حصہ ہیں۔ اُن کے رنج و غم اور محرومیاں طویل اور خوشی و انبساط کے لمحے مختصر ہیں۔ اُن کا مشاہدہ بہت گہرا ہے جذبات نگاری کے بیان میں وہ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ حسن ساہو کا بیانیہ نہایت سادہ اور انداز بیاں روایتی طرز کا عکاس ہے۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں کے درمیان زندگی کا حُسن تلاش کرتے ہیں۔

حسن ساہو اجتماعی زندگی کے قائل ہیں۔ اُن کے بیشتر کردار نہایت جذباتی ہیں۔ ہمت اور حوصلہ کے فقدان کے باوجود زندہ رہنے کی خواہش اُن کے دلوں میں روشن ہے۔ کچھ افسانے عورت اور مرد کے جذباتی رشتوں کی تجدید میں لکھے گئے ہیں جو خوبصورت ہیں اور جن میں زندگی تیز تر ہے۔

(تبصرہ ماہنامہ ”پیش رفت“، دہلی، جون ۱۹۹۷ء)

(ہفت روزہ ”صداقت“، پونہ، ۱۵، جون ۱۹۹۷ء)



حسن ساہوکی سیاسی نقطہ نظر کا پیروکار نہیں ہے وہ صرف رواداری اور مساوات میں یقین رکھتا ہے۔ اور احساس برتری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔۔۔ کچھ اہل ادب تفریحی ادب کو زندگی کا حاصل تصور کرتے ہیں اور کچھ دانشور سماجی مسائل پر لکھنے کو اصل ادب بتاتے ہیں۔ حسن ساہو نے اپنی کہانیوں میں تفریح ادب کو بھی موقع دیا ہے اور زندگی کے مسائل سے متعلق بھی غور و خوض کرنے کی دعوت دی ہے۔ کہانیوں کے اجزائے ترکیبی اُن کی کہانیوں میں ایک معیار بن کر ابھرتے ہیں۔ غرض حسن ساہو کے افسانے قاری کے ذہن کو تفریح بھی مہیا کرتے ہیں اور دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

(تبصرہ ماہنامہ ”پیش رفت“ مارچ ۱۹۹۸ء)



ڈاکٹر سہیل انجم (دہلی)

حسن ساہو کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حساس دل ملا ہوا ہے۔ کیونکہ اُن کے افسانوں میں درد و کرب کی پرچھائیاں بھی ہیں، غم و یاس کی لکیریں بھی، دل شکنگی و افسردگی کی داستانیں بھی اور زمانے کی بے وفائیوں کا ماتم بھی ہے۔

حسن ساہو کے افسانوں کے موضوعات نہ دیومالائی ہیں نہ داستانوی، نہ خیالی ہیں نہ ماورائی بلکہ اُن کے افسانوں کے کردار اس سماج میں چلتے پھرتے اور اسی ماحول کے پروردہ ہیں جس ماحول میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ غرض اُن کے افسانوں کے کردار آج کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان ہیں۔ حسن ساہو افسانہ لکھنے سے قبل سماج میں کردار تلاش کرتے ہیں۔ جب کوئی واقعہ اُن کے دل کے تار کو چھیڑتا ہے تو اُن کا قلم صفحہ قرطاس پر دوڑنے لگتا ہے۔

(تبصرہ اردوبک ریویو، مارچ/اپریل ۲۰۰۰ء)



مرحوم سید محمد جابر جوراسی (لکھنؤ)

حسن ساہووا دی کشمیر کے سنجیدہ اور بالغ النظر صحافی ہیں۔ وہ خاموش ادیب، سماجی کارکن اور اچھے مقرر ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت اور ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُردو والوں کو اُن کی افسانہ نگاری پر فخر کرنا چاہئے۔ عرصہ سے بیشتر افسانے سطحی جذبات کی عکاسی کیا کرتے ہیں۔ اور معاشرے کی اخلاقی قدروں کو تباہیوں کے گہرے غار میں ڈھکیلتے رہتے ہیں لیکن حسن ساہو کے افسانے مختلف و مختصر ہیں جن کو پڑھنے کے لئے قاری کو وقت کی گنجائش نکالنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔ ہر افسانہ معاشرے یا ماحول میں موجود کسی کجی یا قباحت پر مدبرانہ طنز ہے۔ اُن کے افسانے و مضامین زندہ حقیقتوں کی جانب مصلحانہ اشارے کرنے والے ہیں۔

(ماہنامہ ”اصلاح“، لکھنؤ، اپریل ۱۹۹۸ء)



حسن ساہو کا شمار ہمارے عہد کے اُن افسانہ نگاروں
میں ہوتا ہے جو کسی ”ازم“ تحریک یا رجحان سے متاثر
ہوئے بغیر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔
حسن ساہو کے افسانوں کا وصف موضوع کا انتخاب
ہے وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے اپنے افسانوں کا
مواد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اکثر افسانوں میں
انسانی زندگی کی رقی ملتی ہے۔

(ماہنامہ کتاب نما، جنوری ۲۰۰۱ء)



مرحوم ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی (امروہ)

حسن ساہو کہنہ مشق ادیب اور صحافی ہیں۔ اُن کے افسانوں میں کشمیری ماحول، کشمیری مقامات، کشمیری تہذیب، کشمیری ثقافت، وہاں کے پیڑوں اور پھلوں کے نام اور وہاں کے افراد ہر جگہ غالب نظر آتے ہیں۔ علاقائی تہذیب کی بھی ادب میں ایک خاص اہمیت ہے۔ اُن کے افسانوں کے کردار خیر و شر دونوں کا نمونہ ہیں۔ اخلاقی سبق اور آفاقی قدریں حسن ساہو کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ رات و دن سماج میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں اُن کو مصنف نے اپنی کہانیوں کا ہدف بنایا ہے۔ اُن کے قدم ہر جگہ زمین پر لگے رہتے ہیں اُن کے افسانوں کے پلاٹ میں کہیں الجھول نہیں، مکالمے بڑے جاندار ہیں۔ زبان پختہ ہے اور استعارے بڑے دلکش ہیں۔

(تبصرہ ہفت روزہ ”ہماری زبان“ دہلی ۲۱/۱۵ نومبر ۲۰۰۰ء)



”راشٹریہ سہارا“ دہلی (سرینگر)

مصنف حسن ساہو کے افسانوں میں زندگی کی تلخی بھی ہے اور شیرینی بھی، عشق کا سوز بھی اور حُسن کا ساز بھی ہے۔ جہاں تک زبان و بیان کا سوال ہے تو مصنف نے سیدھی سادی زبان کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں افسانوں میں شاعرانہ اندازِ بیان بھی اختیار کیا ہے۔ غرض حسن ساہو کے افسانوں کے پلاٹ اور کردار اُردو کھچر کے دائرے میں ہی گھومتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاح معاشرہ پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ اس لئے اُن کے افسانے اعلیٰ انسانی اسلامی اور ہندوستانی اقدار کے حامل ہے۔

(تاریخ ۲۸ مئی تا ۲۲ جون ۱۹۹۷ء)



شجاع کشمیری جرنلسٹ (سرینگر)

حسن ساہو ایک صحافی، افسانہ نگار، شاعر اور بے باک قلم کار ہیں۔ انہوں نے ادب کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ کئی افسانوی مجموعوں کے علاوہ مذہبی اور سماجی معاملات پر بھی لاتعداد مضامین تحریر کئے۔ زندگی کے مختلف شعبوں پر لکھنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ مجموعی طور ساہو صاحب ایک معیاری ادیب، افسانہ نگار، اور صحافی ہیں جو دکھی انسانیت کے کام آنا عبادت سمجھتے ہیں اُن کی تحریروں میں حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔

اکثر کہانیاں پڑھ کر یہ اصلیت سامنے آ جاتی ہے کہ حسن ساہو نے معاشرے و سماج کا غم اپنے سینے میں سمیٹ لیا ہے۔ زمانے کے حوادث سے متاثر ہونے کے باوجود اُن کی قلمی کاوشوں میں ضعف نہیں آیا۔

(مکتوب ۲۲، جون ۲۰۰۸ء)



حسن ساہو کہانیاں لکھنے میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔ حسن ساہو کی افسانوی زبان بہت آسان ہے۔ اتنی آسان کہ ایک بچہ بھی اُن کی کہانیوں کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ آسان آسان الفاظ میں زندگی کے تجربات پیش کرنا اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ پلاٹ اور کردار میں فنی صلاحیت ڈال کر حسن ساہو روایتیں پار کر کے آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ اُن کا نام سارے ہندوستان میں احترام سے لیا جانے لگا ہے۔ اُن کی ہر کہانی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے۔

حسن ساہو کے افسانوی کرداروں میں زندگی جھانکتی ہے اور ہر کردار کسی نہ کسی موڈ پر گہرے نقوش چھوڑ دیتا ہے۔

(تیسرہ روزنامہ ”روئیداد جہاں“ سرینگر ۲۱، جنوری ۱۹۹۷ء)

☆☆☆

حسن ساہو کے افسانوں اور کہانیوں میں ہندوستان کی مٹی کی مہک سی ہوتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں خاص طور پر کشمیری عوام کی موجودہ سلگتے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ افسانے کشمیری عوام پر کئے جا رہے ظلم و ستم، اُن کی زبانوں پر پڑے ہوئے تالے اور زخمی روح کی تڑپ کی حقیقی عکاسی کر رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی پُر فریب چالوں، مکار سیاست دانوں کی عیاریوں اور بے رحم حکومت کے جبر و ظلم کی داستانیں اُن کی کہانیوں کے خاص موضوع ہیں۔ اُن کے افسانوں کے کردار دراصل ہماری آپ کی دنیا کے جانے پہچانے انسان ہیں جنکی زندگی ایک مجبور و بے بس انسان کی دبی دبی سسکیوں اور زخمی لبوں پر ادھوری آہ کی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔

(تبصرہ۔ ماہنامہ ”گلابی کرن“، دہلی، اپریل ۲۰۰۲ء)



عام روش سے ہٹ کر آپ افسانے تحریر کرنے لگے ہیں
یہ خوش آئند بات ٹھہری۔ ”نمک حلال“ ایک اچھوتے موضوع کو
افسانچہ کی شکل دینا اور اتنی کامیابی کے ساتھ نبھائے جانا کوئی
آسان بات نہیں۔ آپ کی سوچ میں بلا کی پختگی سامنے لگی ہے۔
(مکتوب ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء)



مولانا غلام حسین باقری (ناگپور)

”اندھا کنواں“ دیکھنے پر مجھے کشف ہوا کہ حسن ساہو
مجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ قلم کار میں بلا کی تیز رفتاری موجود
ہے۔۔۔ حقیقی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو اس انداز
سے تحریر میں لایا گیا ہے کہ جیسے قاری جائے واردات پر موجود ہو۔
متعلقات و جزویات کو سلیقہ سے زینتِ قسط اس کیا گیا ہے۔
(مکتوب ۱۶، اکتوبر ۲۰۰۳ء)



ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر)

حسن سا ہوا ایک کہنہ مشق ادیب اور صحافی ہیں۔ اُن کے
افسانے و مضامین برسوں قبل سے زیر مطالعہ رہے۔ اور آج تک
بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔

(مکتوب ۱۹، نومبر ۱۹۹۷ء)



بے تاب جے پوری (جموں)

شاید میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ لیکن آپ میرے لئے اجنبی
نہیں۔ آپ کے افسانے اور مضامین میں شوق سے طالب علمی
کے زمانے سے پڑھتا آیا ہوں۔

آپ کو معاشرے و سماج میں پھیلی قباحت کو اجاگر کرنے
میں یدِ طولی حاصل ہے۔

(مکتوب ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء)



ڈاکٹر فاضی اشرف سرینگر

”اندھا کنواں“ کے سب افسانے ایک دم حقیقت لگتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ واقعی سب افسانے ”پیش لفظ“ پر برابر اترتے ہیں۔ زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے اور اس بابت خوش ہوں کہ حسن ساہو ایک عام قاری کے لئے لکھتے ہیں۔ ساہو صاحب کے لئے چند اشعار کشمیر میں۔

ژ چھکھ اکھ داستان سر بستہ اکھ راز

کتابا اکھ ڈلتھ انسانہ سُنڈ ماز

دلیلا ز بیٹھ پچھنہ۔ تھہ آنتھ یا اند

چھہ۔ تھہ مژ ساسہ بڈر افسانہ سر بند

قوی العزم ژ اکھ دیو قامت

دُعابو زین خود اتھاوئے سلامت

ژ ساہو داستان سر بستہ اکھ راز

چھہ۔ تھہ رازس اندر کُل وجد تکی ساز

(مکتوب ۲۰ فروری ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

آپ کے ادبی اور صحافتی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔
 ”اندھا کنواں“ اور ہفت روزہ ”دوران“ کا مطالعہ کر کے یقین
 ہو چلا ہے کہ آپ کے ذہن کی تمام کھڑکیاں سمندر ادب و صحافت
 کی طرف کھلتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ حقیقت نگاری کا فن آپ
 کے دوران خون میں شامل ہے۔

(مکتوب ۲۸ جولائی ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

عبدالرشید شاہ (چیف ایڈیٹر ہفت روزہ ”ندائے مشرق“ سرینگر)

حسن ساہو کشمیر کے ایک ممتاز اور صاحب طرز فکر ادیب
 ہیں۔ اُس کی تازہ تصنیف ”اندھا کنواں“ چند خوبصورت اور
 تحریک پسند افسانوں کا مجموعہ ہے۔

(اداریہ ”ندائے مشرق“ ۵ ستمبر ۱۹۹۶ء)

☆☆☆

خنداں لکھنوی (سرینگر)

حسن ساہو کا افسانوی مجموعہ ”پھول کا ماتم“ میرے پیش نظر ہے۔ میں نے بعض افسانے پڑھے جو یقیناً صف اول کے افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ اُن میں مقصدیت بھی ہے اور سسپنس بھی، ماحول کی ترجمانی بھی اور ماحول کی بعض کیفیات پر ناقدانہ اشارے بھی ملتے ہیں۔ حسن ساہو زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں خوش اسلوبی سے کہہ جاتے ہیں۔

(ہفت روزہ ”مدینہ العلم“، لکھنؤ، ۵، اپریل ۱۹۸۵ء)



ایڈیٹر ہفت روزہ ”سیاست“ (جموں)

حسن ساہو کو نہ صرف اُردو زبان پر پورا پورا عبور حاصل ہے بلکہ انہیں فنِ افسانہ نگاری میں بھی یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ حسن ساہو نے جس خوبصورتی سے اپنے خیالات و جذبات کو الفاظ میں جامہ پہنایا ہے وہ اُن ہی کا حصہ ہے سلیس اور بامحاورہ زبان کا استعمال خوبصورتی سے کیا ہے۔

(۱۱ مارچ ۱۹۸۲ء)



سید سجاد حسین رضوی (سرینگر)

حسن ساہو ایک معتبر کہانی کار کے علاوہ بہترین مضمون نویس بھی ہیں۔ سیاسی، سماجی اور ادینی طرز کے مضامین ضبط تحریر میں لانے میں حسن ساہو کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اُن کے افسانے ہمارے سماج اور معاشرے میں موجود اچھائیوں اور برائیوں کی خوبی کیساتھ ترجمانی کرتے رہتے ہیں۔ زبان سلیس اور عام فہم کہ معمولی سے معمولی پڑھا لکھا قاری بھی متاثر ہو۔ ”گردش دوران“ یقیناً ادبی و علمی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

(مکتوب ۱۷ جولائی ۲۰۰۸ء)

رام پرکاش کپور (ہریانہ)

آپ کے حقیقت پر مبنی کچھ افسانے راہنمائے تعلیم میں
پڑھ چکا ہوں۔ بہت پسند آئے۔ آپ کا افسانہ ”ایک پہلو یہ بھی
ہے“ دوبارہ پڑھ کر بھی دل کو چھو گیا اور آپ کا حقیقت پسندانہ
انداز بہت ہی خوب ہے۔

(مکتوب ۲۹ مئی ۲۰۰۵ء)

☆☆☆

انجنیئر ارشد حسین خان (سرینگر)

حسن ساہو کے کچھ مضامین اور افسانے جریدوں و
اخباروں میں پڑھنے کا موقع ملا۔ حسن ساہو ایک ممتاز صحافی، تجزیہ
نگار اور افسانہ نویس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فعال سماجی کارکن
بھی ہے۔

(مکتوب ۱۳ جولائی ۲۰۰۸ء)

☆☆☆



ادب کی مثال ایک سمندر کی سی ہے جس میں ہر سے چھوٹی بڑی لہریں اُبھرتی رہتی ہیں۔ بعض لہریں سطح پر نمایاں ہوتی ہیں اور بعض پانی کی گہرائیوں میں۔۔۔۔۔ ہاں سمندر کی گہرائیوں میں اُبھرنے والی لہریں دکھائی نہیں دیتی ہیں لیکن گہرائیوں کی گہرائیوں کو چیرتی ہوئی یہ لہریں اُوپر اُٹھ کر ایک طوفان کی سی صورت لیتی ہیں میرے خیال میں حسن ساہو کی کہانیاں ان ہی لہروں کی مانند ہیں جو سمندر کی خاموشیوں کو چیرتی ہوئی ایک ہلچل بپا کرتی ہیں۔ ذہنی ہلچل، سوچنے اور کہنے کی ہلچل، کچھ کہنے اور کچھ سننے کی ہلچل۔۔۔۔۔ حسن ساہو کی شخصیت میں جو خلوص، سادگی اور نفاست ہے اُن کی تحریروں میں اُس کی بھرپور جھلک ملتی ہے وہ درد و کرب ملتا ہے جو ہماری آج کی زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے اس وجہ سے اُن کی کہانیاں زندگی سے زیادہ قریب نظر آتی ہیں اور اُن کے کردار اُس پاس گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ معاشرتی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی سے کرتے ہیں، اُن کی کہانیوں میں مقامی رنگ ہے، انسانی نفسیات کی باریکیاں ہیں، واقعات اور حادثات کا دلچسپ پھیلاؤ ہے کہانی پیش کرنے کا اُن کا اپنا ایک انداز ہے۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حسن ساہو کی کہانیاں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انہیں آنے والے کل پر پورا پورا بھروسہ ہے۔۔۔۔۔ !!!

نور شاہ

Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services H.Q., Batamaloo, Srinagar, Kashmir-190009

Phone : 2470851 Fax 0194-2457215 Cell : 9419002212, 9906677468

E-mail : meezanpublishers@rediffmail.com